راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

نومبر 2018ء

نامور شاعر عباس تابش سے

پارٹ ٹائم شاعر نہیں ہوں، مستقل شعری مزاج میں رہتا ہوں

میں نے خود اپنا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا مخالفین نے رکھا ہے

مدیر اعلیٰ ارژنگ معروف شاعر، کالم نگار، سفرنامہ نگار

عامر بن علی کا مکالمہ

ہر تہذیب کا سب سے توانا اور موثر مظہر اس تہذیب کا ادب ہوتا ہے۔ پاکستانی تہذیب اپنی قدامت کے حوالے سے اور پاکستانی ادب اس قدامت کا مظہر ہونے کے ناطے، ایک عظیم تر ماضی کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم تر حال کا بھی حامل ہے۔ پاکستانی ادب بہت بڑی روایات فکروفن کے تسلسل کا منظرنامہ ہے۔ عباس تابش پاکستانی ادبا کی اس نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر ہیں جس نے نہ صرف یہ کہ پاکستانی ادب کی آفاق گیر روایات کو اپنی روح میں سمویا بلکہ اپنی جرات مندانہ ہنرمندی کا بدن بھی عطاء کیا۔ یہ تمہیدی الفاظ خالد احمد کے ہیں کہ عباس تابش اپنی ہنرمندی کے حوالے سے اپنے ہم پیشہ وہم مشرب وہم عصروں سے منسلک ہوتے ہوئے بھی منفرد نظر آتا ہے۔ آنکھ بدن کا چراغ ہے اور عباس تابش پاکستانی ادب کے ہرے بھرے بدن کا تازگی آفرین چراغ ہونے کے ناتے اس جسد کا نور ہے۔ جنوبی پنجاب کی تحصیل میلسی میں 1961 میں پیدا ہونے والے اس خوش فکر شاعر نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا اور آج کل لاہور میں ہی تدریس کے شعبے سے منسلک ہیں۔ اب تک انکے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ارژنگ کے قارئین ان سے ہونے والی گفتگو کو امید ہے ضرور پسند فرمائیں۔

ارژنگ:۔ شروع سے بات کی شروعات کرتے ہیں۔ شعری سفر کا آغاز کب اور کیسے کیا؟

جواب:۔ شاعری کا آغاز 1975 میں کیا، میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، ہمارے ایک استاد کا تبادلہ ہوا تو مجھے پوچھا گیا کہ آپ نے کچھ کہنا ہے تو میں نے کہا کہ میں نظم پڑھوں گا، جسے نظم سمجھ رہا تھا وہ نظم نہیں تھی نثر تھی۔ ایک دن میں اپنے گھر بیٹھا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک بلدیہ کا باغ ہے، وہاں سے کوئی آواز آ رہی تھی، عموماً لوگوں کے بات کرنے کی آواز ہوتی ہے لیکن وہ آواز کافی مختلف تھی تو میں نے والد صاحب سے اجازت لی اور وہاں چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک صاحب کچھ پڑھ رہے ہیں اور باقی واہ واہ کر رہے ہیں۔ میں سنتا رہا اور سوچا کہ یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ ایک وجہ تو یہ بنی، دوسرا یہ کہ ہمارے والد صاحب پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن انہیں شاعری کا بڑا ذوق تھا، سورۃ یوسف کی تفسیر جو مولوی عبدالستار اور مولوی غلام رسول نے لکھی ہیں۔ وہ رات کو ان کتابوں میں سے اشعار سنا کرتے تھے، اس کے بعد انہوں نے مجھے بانگ درا لے کے دی تو اس کے بھی کچھ شعر یاد کیے۔ ہمارے سکول میں بیت بازی کا سلسلہ ہوتا تھا تو میں اس میں حصہ لیتا تھا تو ان سب عوامل کے ملاپ سے میرا مزاج بن گیا کہ شائد میں شاعر بن سکتا ہوں۔ میں میٹرک میں تھا تو والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غربت تو گھر میں پہلے ہی تھی جو والد صاحب کے انتقال کے بعد شدید ہوگئی۔ ہم چار بہن بھائی تھے اور والدہ محنت کر کے ہمیں پالتی تھیں۔ والدہ نے کہا کہ تعلیم نہیں چھوڑنی لیکن وہ میری شاعری کے خلاف تھیں۔ وہ سوچتی تھیں کہ شاعر بیکار ہوتے ہیں اور اگر میرا بیٹا اس کام میں پڑ گیا تو پڑھے گا نہیں۔ جب ہم رات کو صحن میں سوئے ہوتے تھے تو میں چاندنی میں انتظار کرتا تھا کہ سب سو جائیں تو میں اٹھ کر شعر لکھوں، ادھر میں کاغذ قلم نکالتا اور ادھر ان کی آنکھ کھل جاتی تو گھر میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی کہ جہاں میں چھپ کر شعر کہوں اور پتہ نہ چلے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 19 نومبر 2018 شمارہ نمبر 10

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

◉ ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (امریکہ) ◉ ارشد نذیر ساحل (چین)

کمپوزنگ • زریاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر • نعمان حسن : 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس • محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 عزہ اکاوری : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ، یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت / ۲

مناجات / ۳

مضامین:

○ اردو ادب میں نسائی شعور / پروفیسر رئیس فاطمہ ۶

○ عربی شاعری کے تراجم / محمد ممتاز راشد لاہوری ۱۰

○ نظری، اطلاقی اور نقد الانتقادی تنقید / ازور شیرازی ۱۱

○ چھین لیا ہے تم سے اسلم جیسا یار درخشو! / عمران شناور ۱۴

○ ساہواں تے دریاواں وچ تردیاں نظماں / انجم الحسنین حیدر ۱۶

○ صاحب ...... حسن عباسی کی حمدیہ کاوش / نوید مرزا ۱۸

طنز و مزاح

○ خوف / عطاء الحق قاسمی ۲۰

○ ابدالین / احمد سعید ۲۲

افسانے

○ سمندر سراب میں / حنیف سید (انڈیا) ۲۳

○ شبو / ثمینہ سید ۲۶

○ اندھیرے اجالے / طلعت سلیم ۲۹

شعری گوشے:

○ طارق اسد، آفتاب احمد، ثمینہ راؤ ۳۱ تا ۳۳

سفرنامہ

○ دوبئی کا پاکستان سنٹر / عامر بن علی ۳۴

○ فیری میڈوز اور وادی ہنزہ / ایم-آر-شاہد ۳۵

○ شاعری ۳۸

○ سمندر پارے ۳۹

مختصر ادبی خبریں ۴۰

○ انٹرویو: عباس تابش ۴۲

○ انٹرویو: ڈاکٹر سعید اقبال سعدی ۴۴

تبصرہ کتب ۴۶

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

آپ کا جو نخرہ ہے صاحب
آپ کو ہی زیبا ہے صاحب
یونہی چپ رہتا ہے ورنہ
سب کی ہی سنتا ہے صاحب
سب ہی چوم کے رکھ دیتے ہیں
آپ نے کیا لکھا ہے صاحب
آپ کی باتیں کرتے رہنا
اپنا تو نشہ ہے صاحب
اک لڑکی اچھی لگتی ہے
آپ سے کیا پردہ ہے صاحب
سوچیں بھی تو کیا سوچیں
سوچیں بھی سنتا ہے صاحب
آپ کے در پہ آیا تھا میں
اس پہ بھی تالا ہے صاحب
آدھی رات کو کیوں ملتے ہو
کاہے کا خطرہ ہے صاحب
باتوں میں اُلجھاتے کیوں ہو
بندہ تو سادہ ہے صاحب
مجبوری میں کیا بولیں ہم
سودا تو مہنگا ہے صاحب
اپنا ذکر نہیں ہے کوئی
آپ کا ہی چرچا ہے صاحب

حسن عباسی/لاہور

آس ہے یہ روضۂ سرکارؐ دیکھوں
دیکھنے والے ہیں جو انوار دیکھوں
اپنی آنکھوں کو جھکاؤں پھر اٹھاؤں
روزِ محشر قافلہ سالار دیکھوں
ایک دن آئے، مدینہ جا کے میں بھی
رحمتوں والے وہاں آثار دیکھوں
مصطفیٰؐ کا دستِ انور چومتی تھی
چشمِ حیراں سے وہی تلوار دیکھوں
میری آنکھوں میں سمائیں جلوے نُوری
سبز گنبد سے جڑے مینار دیکھوں
عمر میری شہرِ طیبہ میں بسر ہو
روز و شب بس آپؐ کا دربار دیکھوں
چہرے روشن ہو گئے سب کے خوشی سے
ہر کسی کو میں وہاں سرشار دیکھوں
ہے دعا یہ آپؐ کا روئے مبارک
خواب میں ہر روز میں سرکارؐ دیکھوں

ڈاکٹر اخلاق گیلانی/لاہور

روشن ہے یہ جہان محمدؐ کے نام سے
سورج تو فیض پاتا ہے ان کے غلام سے
ہوتی نہیں ہے رد کبھی اُن کی تو التجا
کرتے ہیں ذکر آپؐ کا جو اہتمام سے
میرے بھی حوالے اسی کے سبب سے ہیں
نسبت ہے میری خاص محمدؐ کے نام سے
اہلِ عجم کو پیار سے اپنا بنا لیا
اہلِ عرب کو بدلا ہے حسنِ کلام سے
دُنیا خود اپنے آپ ہی بدلے گی ایک دن
دنیا نے فیض پانا ہے دیں کے نظام سے
اے منکرِ خدا مرے آقاؐ کے پاس آ
پتھر بھی کلمہ پڑھتے ہیں اُن کے پیام سے
آسی بدن میں جان مدینے کی صبح سے ہے
پاتا ہوں زندگی میں مدینے کی شام سے

عدیل احمد آسی/ڈنمارک

اتنا حسین گنبدِ خضریٰ ہے سامنے
میرے نبی ﷺ کے نُور کا جلوہ ہے سامنے
قسمت میں اُس کے لکھی ہے ہر بار مات ہی
لڑنے علیؓ پاک سے آتا ہے سامنے
خواہش کے بت گرے ہیں مجھے دیکھ دیکھ کر
سر جب جھکا ہے میرا جو مولا کے سامنے
آنے لگا شعور اُسے ہر گھڑی سہیل
جو بھی درِ رسول ﷺ کے بیٹھا ہے سامنے

اعظم سہیل ہارون/حاصل پور

حاصل پور میں مقیم نوجوان شاعر
اعظم سہیل ہارون کا نعتیہ مجموعہ

نور کا جلوہ

شائع ہو گیا ہے
صفحات: -/128 قیمت: -/300
اہتمام: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
0300-4489310

مناجات/ خاک پر خاک
(اس نظم کا آغاز میدانِ عرفات میں جبل رحمت کی چوٹی پر ہوا)

سلیم ساگر/ لاہور

اگرچہ خدایا بدن کی زمیں   کسی دیوتا کے بھی قابل نہیں
مگر ایک دل بھی عطا ہے تری   کہ جس میں بہت سی جگہ ہے تری
ترے واسطے دل کا در ہے کھلا   تو آئے تو یہ پاک گھر ہے کھلا
زمانوں پہ فرماں روائی تری   جہانوں میں جلوہ نمائی تری
ستاروں سے آگے جہاں ہیں تو کیا؟   ترے لاکھ کون و مکاں ہیں تو کیا؟
پہنچتی ہے تجھ تک دلوں کی دُعا   کہ سنتا ہے تو دھڑکنوں کی صدا

خزانوں کے خالق ترا شکر ہے
زبانوں کے مالک ترا شکر ہے

میں کہتا تو ہوں رنگِ گویائی دے   سخن کو مرے عزت افزائی دے
میں کہتا تو ہوں کارخانے بھی ہوں   کئی آشیانے خزانے بھی ہوں

میں قارون ہر دوجے انسان سا
مجھے تو غنی کر دے عثمانؓ سا

مجھے میرؔ و غالبؔ نہ بے شک بنا   خزانوں کا طالب نہ بے شک بنا
نہ چاہے تو ہاتھوں میں تقدیر دے   قلم دے اور اعجازِ تحریر دے
وہ خود آگہی دے اے دل کے مکیں   مرا ظرف ہو جائے ظرفِ زمیں
"اُٹھا ساقیا پردہ اُس راز سے   لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے نہیں
ابھی ساز و آواز بدلے نہیں
نہیں دورِ سرمایہ داری گیا
ابھی تک نہیں یہ مداری گیا"

وفادار کس کا زمانہ ہے یہ   جفاؤں کا اک کارخانہ ہے یہ
یہ زنجیر ہے یا نفس ہے مرا   وفا ہے مری یا قفس ہے مرا
نہ کھا جائیں تیری بلائیں مجھے   کہ دیتی ہیں دعوت خطائیں مجھے
یہاں کوہکن اور قیس آئے ہیں   مگر تیرے بندوں کو کب بھائے ہیں

کچھ ایسا محبت کا اعجاز دے
جہاں سے جداگانہ انداز دے

تری بزم میں باریابی رہے   خدایا تری ہم رکابی رہے
تو ہے حسن اور عشق کی سلسبیل   میں عاشق ہوں تیرا اے ربِ جمیل

خبر ہے کہ یہ جان لیوا بھی ہے
محبت مگر ایک میوہ بھی ہے

محبت کا سارا فسانہ ہے یہ   محبت کے دم سے زمانہ ہے یہ
"محبت حقیقت محبت مجاز"   محبت عبادت محبت نماز
محبت سے ملتا ہے دل کو گداز   محبت سے کھلتے ہیں پوشیدہ راز
محبت حوالہ ہے رحمٰن کا   محبت اُجالا ہے منان کا
محبت خزانہ ہے عثمانؓ کا   محبت ترانہ ہے حسانؓ کا
محبت خلاصہ ہے وجدان کا   محبت اثاثہ ہے انسان کا
محبت تقاضہ ہے ایمان کا   محبت ہی لہجہ ہے قرآن کا
محبت ہے ایجاد رحمٰن کی   محبت ہے بنیاد انسان کی

محبت ہے قدرت کا زریں اصول
یہ قربِ خدا ہے یہ عشقِ رسولؐ

خدایا محبت کی جاگیر دے   مجھے میرے خوابوں کی تعبیر دے
محبت عطا کر جو فانی نہ ہو   وفا میں مرا کوئی ثانی نہ ہو
مری شاعری سے زمانے بنا   مری عاشقی کے فسانے بنا
یہاں جب کسی کو جوانی ملے   تو پڑھنے کو میری کہانی ملے
ابد تک چمکتا ستارا رہوں   محبت کا اک استعارہ رہوں
جو کہتا ہوں میں ہر کسی کو سنا   جو دیکھا ہے میں نے وہ سب کو دکھا
وفادار ھی تیرا بندہ ہوں میں   خطاکار بھی تیرا بندہ ہوں میں

کہوں کیا خطاؤں کی میں اصل کا
وہ دانہ تھا گندم کا یا وصل تھا

جو جنت میں آدمؑ اکیلا گیا   تو اکلاپا اُس سے نہ جھیلا گیا
کسک جب نہ دل سے نکالی گئی   تو حوا سے جنت سجا لی گئی

جو ہونے لگا دونوں روحوں میں میل
تو آدم نے سیکھا محبت کا کھیل
وہ آدمؑ سے حوا کا اصرار تھا
جو کہتے ہیں ابلیس کا وار تھا
سو آدمؑ کے حصے خسارا گیا
اور اُس کو زمیں پر اُتارا گیا

صدا آئی یہ اوجِ افلاک سے
کہ پیوستہ خاکی رہے خاک سے

وہ لنکا میں اُترا تو مکہ گیا
پہاڑوں پہ جا جا کے کہتا پھرا
مجھے بخش دے رب خاکِ صفا
کہ تیرے نبی ہیں شہ دوسرا
وہ جنت کہ تھا ایک یوٹوپیا
جہاں تھی ہر اک تیری نعمت سوا
یہ دنیا ہے تیری یہ تیرا جہاں
نہیں جس میں خاکی کو کوئی اماں

جو جنت میں حوا کا میلہ رہے
تو آدمؑ یہاں کیوں اکیلا رہے؟

نہیں مانگتا میں خدائی نہ دے
مگر مجھ کو داغِ جدائی نہ دے
نہیں ہے اگر میری جنت جگہ
زمیں پر مجھے میری حوا ملا
پسند آئی تجھ کو نہ کوئی ادا
مگر جبلِ رحمت پہ کی جب دُعا
بدن دونوں چوٹی پہ لائے گئے
جو روحوں تلک پھر ملائے گئے

سو خاکی میں خاکی پرویا گیا
نئی خاک کا بیج بویا گیا

کھلا روحِ انساں میں رنگِ بدن
تو رہنے لگی جان تنگ بدن
چلا ایسا ہاتھوں سے سنگِ بدن
نہ باقی رہا نام و ننگ بدن
چلا تھا کہاں سے تفنگِ بدن؟
کہاں تک چلے گی یہ جنگِ بدن؟

یہ لذت جو تو نے بنائی نہ ہو
بدن کی بدن تک رسائی نہ ہو

محبت تھی اقلیما ہابیل کی
لڑائی ہوئی جس سے قابیل کی
لگا دی بدن سے لہو کی سبیل
سلام اے محبت کے پہلے قتیل

وفا سے جڑی بے وفائی نہ ہو
تو پھر آدمی میں لڑائی نہ ہو

جو قسمت کو گوندھا گیا چاک پر
اک آدمؑ کا بیٹا بنا خاک پر
زمیں ایک جنت بنا دی گئی
جہاں بنت حوا بسا دی گئی

سکھایا گیا پھر محبت کا کھیل
تو ہونے لگا دونوں روحوں میں میل
محبت میں دو دل دوانے لگے
زمیں آسماں مسکرانے لگے
وفادار آنکھیں چمکنے لگیں
محبت کی شمعیں دمکنے لگیں
پھر آئی خطا اک نئے روپ میں
وفادار مونس کے بہروپ میں
جہاں سے کہانی بدلنے لگے
نفوس آگ پانی بدلنے لگے
بنایا تھا تو نے جسے خاک سے
تو واقف تھا، ہلکا ہے خاشاک سے
وہ ساحل پہ تھا اور اُٹھا لے گئی
خطا کی روانی بہا لے گئی
وہ جنت میں تھا اور چرا لے گئی
عجب خاک داں میں چھپا لے گئی

بقا کی تڑپ سے لگا لے گئی
قضا تھی جو سوئے فنا لے گئی

پھر آدمؑ کے حصے خسارا گیا
پھر اُس کو زمیں پر اُتارا گیا
یہ غم جب نہ اُس سے سہارا گیا
تو وہ جبلِ رحمت دوبارا گیا

پہاڑی پہ چڑھ کر پکارا تجھے
کہ کرنا تھا کوئی اشارا تجھے

تھا خوش میں بہت تیرے افلاک پر
رضا تھی تری تو گیا خاک پر
جو محروم رکھنا تھا یاں خاک سے
اُتارا تھا کیوں تو نے افلاک سے؟
فراق آشنا تھی جوانی میری
سمجھتا ہے بس تو کہانی مری
تھا گردش میں ایسا ستارہ مرا
نہیں چل رہا تھا گزارا مرا
فنا کی طرف تھی روانی مری
بہا لے گئی زندگانی مری
عجب اک جفا سے شناسا ہوا
کہ پی کر وہ پانی میں پیاسا ہوا
نہ ابلیس نے آزمایا مجھے
اک آدم نے رستہ بھلایا مجھے

سمجھتا ہے اتنا تو جب چاک کو
بناتا ہے کیوں خاکِ ناپاک کو

وفا کی طلب تھی خدایا مجھے
جفاکار سے کیوں ملایا مجھے؟
وفا کا فسانہ سنایا مجھے
کہ دامِ جفا میں پھنسایا مجھے
تصنع کا چہرا دکھایا مجھے
محبت کا جھولا جھلایا مجھے
ضرورت نے فتنہ بنایا مجھے
کہ انکار کرنا نہ آیا مجھے

مقدر نے میرے مٹایا مجھے　　اُٹھا لے گیا ایک سایا مجھے

ازل سے مقدر کا شاکی جو تھا
خطاؤں کے خالق! میں خاکی جو تھا

یہ توفیق تو نے عطا کی نہ ہو　　تو خاکی نے کوئی خطا کی نہ ہو
خطا سے نہ گر اس کا رشتہ رہے　　تو پھر کیوں نہ آدم فرشتہ رہے

کھلا ہے درِ توبہ افلاک پر
تو طے تھا کہ ہوگی خطا خاک پر

میں صورت شکستہ وفا کی جو ہوں　　میں مورت خود اپنی جفا کی جو ہوں
میں تصویر اپنی قضا کی جو ہوں　　میں تقدیر اپنی فنا کی جو ہوں
ملی ہیں یہاں وہ سزائیں مجھے　　کہ بھولی ہیں ساری دُعائیں مجھے
نہ توڑوں گا اپنی وفا کا بھرم　　کہ پہلے نہ کھائی تھی میں نے قسم

ترے ہاتھ ہے سب جزا و سزا
مجھے بخش دے ربِّ خاکِ صفا

تو ایسی مجھے پارسائی نہ دے　　"کہ تیرے سوا کچھ دکھائی نہ دے"
وہ وجدان دے میرے ادراک کو　　کہ پہچان لو خاکِ ناپاک کو
ترے ہاتھ ہے وہ ستارا مرا　　مقدر لکھا جس پہ سارا مرا
ترے دم سے بہتا ہے دھارا مرا　　کہاں کھو گیا ہے کنارا مرا
نہیں مانگتا میں خدائی نہ دے　　مگر میرے بت کی جدائی نہ دے
وہ میرا ہے تو اُس کو میرا بنا　　اندھیرے کا میرے سویرا بنا
چراغ محبت حوالہ رہے　　شبستاں میں میرے اُجالا رہے

وفا کے مغنی، جفا کے نفیر
ہے بس تو علیٰ کُلِّ شَیءٍ قدیر
محبت کے داعی، دلوں کے سفیر
ہے بس تو علیٰ کُلِّ شَیءٍ قدیر
سمیع و بصیر و علیم و خبیر
ہے بس تو علیٰ کُلِّ شَیءٍ قدیر

اقبال حیدر/جرمنی

جس سمت دیکھو ملتے ہیں پتھر مزاج لوگ
کیا ہو گئے جہاں سے پیمبر مزاج لوگ
دل میں خلوص بھی ہے یہ میں جانتا نہیں
کہنے کو پوچھ لیتے ہیں اکثر مزاج لوگ
اپنی نہیں بجھاتے تھے جو دوسروں کی پیاس
ڈھونڈنے نہیں وہ ملتے سمندر مزاج لوگ
باتیں کریں تو شعلۂ لہجہ لگا دے آگ
رکھتے ہیں آج آگ سے بڑھ کر مزاج لوگ
اب خیر ہے اسی میں کسی سے ملا نہ جائے
ہر موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں شر مزاج لوگ
جاؤ جدھر انا کے بتوں سے ہے سامنا
دیکھو جدھر تو ملتے ہیں آذر مزاج لوگ
محفوظ آج صنعتِ شیشہ گری نہیں
آئینہ توڑتے ہیں سکندر مزاج لوگ
شہرِ ادب نہیں یہ ہیں گونگوں کی بستیاں
اقبال اب کہاں ہیں سخنور مزاج لوگ

....

مدت سے رات دن ہیں اسی پیش و پس میں ہم
ہیں اختیارِ غیر میں یا اپنے بس میں ہم
یادِ وطن میں لگتا ہے یوں موسمِ بہار
لیتے ہیں سانس جیسے خزاں کی اُمس میں ہم
یادِ چمن کے کیف کی کیا دیجیے مثال
ہر مرتبہ نہائے ہیں پھولوں کے رس میں ہم
صحرا میں دل ضرور لگانا پڑا تو ہے
جیتے ہیں واپسی کے سفر کی ہوس میں ہم
خوں کھنچ گیا ہے اور جبیں پر شکن نہیں
پھولوں کو دیکھتے ہیں خیالِ مگس میں ہم
یہ دھڑکنیں نہیں ہیں دلِ بے قرار کی
سنتے ہیں آشیاں کی صدائیں قفس میں ہم
یادِ چمن میں ہوتا ہے یوں بھی کبھی کبھی
پھولوں کا کیف ڈھونڈتے ہیں خار و خس میں ہم

اُردو ادب میں نسائی شعور

پروفیسر رئیس فاطمہ

بات جب تانیثیت یا نسائی شعور کی ہوتی ہے تو مجھے وہ دور یاد آ جاتا ہے جب ریل گاڑیوں میں زنانہ اور مردانہ ڈبے الگ الگ ہوا کرتے تھے اور مرد حضرات مختلف اسٹیشن پر اُتر کر اپنی خواتین سے ان کی ضروریات سن کر انھیں پورا کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑ لگا دیتے تھے۔ میں ذاتی طور پر ادب میں زنانہ و مردانہ ڈبوں کی قائل نہیں۔ ادب تو ادب ہوتا ہے، نہ کہ مرد یا عورت؟ سوائے چند مخصوص صنفی جذبات کے مردوں اور عورتوں کی سوچ میں زیادہ فرق نہیں......

لیکن حاکمانہ طبقہ مرد کو صرف ناول نگار کہتا ہے۔ جبکہ عورت کے لیے ''خاتون ناول نگار'' یا افسانہ نگار کہا جانا ضروری ہے۔ اسی طرح خاتون شاعرہ یا خاتون تنقید نگار کہنا بہت ضروری ہے۔ تحقیق وتنقید کے حوالے سے جب میری کتاب ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ'' اور مختلف تنقیدی مضامین کا مجموعہ پچھلے دنوں ''ارتکاز'' کے نام سے منظر عام پر آیا تو اسے پذیرائی تو بہت ملی لیکن لکھنے والوں نے بات شروع کی تو اس جملے سے کہ ''تنقید کے میدان میں خواتین کے بہت کم نام نظر آتے ہیں''

کچھ عرصہ سے نسائی ادب اور نسائی شعور کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا ایجنڈا ہی ہے۔ نسائی شعور سے مراد اگر وہ سوچ ہے جسے ''بے باکی'' اور ''دریدہ دہنی'' کہا جائے اور جس پر چند مخصوص سوچ رکھنے والی ادیباؤں اور شاعرات کو فخر ہے تو اور بات ہے، ورنہ کسی مرد ادیب کا لکھا ہوا کون سا افسانہ یا ناول ہوگا جس میں عورت کا ذکر نہ ہو؟ اور وہ کون سی شاعری یا افسانہ نویس خاتون ہوگی جس کی تحریر جنس مخالف کے ذکر سے خالی ہوگی؟ دراصل یہ سارا کھڑاگ اس لیے کھڑا کیا گیا کہ بعض خواتین نے شاعری میں وہ تجربات کیے جو اس سے پہلے ممکن نہیں تھے۔ خاص طور سے جنس کو اس طرح موضوع بنانا کہ وہ جنس بازاری بن جائے۔ قربت کے لمحات اور خالصتاً نجی احساسات اور رویوں کو بیڈروم سے نکال کر چوراہے پہ رکھ کر فوری شہرت اور توجہ حاصل کرنا یقیناً معیوب ہے۔ اس سلسلے میں عصمت کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ انھوں نے ''لحاف'' لکھ کر فوری توجہ حاصل کرنی چاہی تھی لیکن ایسا نہیں ہے۔ ''لحاف'' میں الفاظ کی حد تک ایسا کچھ نہیں ہے جسے فحاشی کہا جا سکے۔ البتہ ہماری بعض نام نہاد اور بزعم خود ''نسائی ادب'' کی علم بردار خواتین نے نسائیت کے نام پر جو خرافات ادب میں شاعری کے ذریعے بکھیری ہیں۔ اس پر سوائے شرمندگی کے انھیں کچھ نہ ملا۔ البتہ اس بے باک سوچ اور زندگی میں سگریٹ، مغربی مشروب اور اب دیگر نشوں کی شمولیت سے انھیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ان کی تحریریں مزہ لے لے کر پڑھی جانے لگیں...... لیکن اس وقت ہمیں ان سب سے کوئی بحث نہیں۔ کیونکہ ایوانِ ادب میں داخلے کے لیے صرف بے باک اور منہ پھٹ ہونا ہی کافی ہے۔ کوئی مزے مزے کے کھانے ادیبوں اور شاعروں کو کھلا کھلا کر اپنا نام پیدا کر رہا ہے۔ کسی کے پاس پیسہ ہے تو اس کے دل اور گھر کے دروازے ان سب ادیبوں اور شاعروں کے لیے ہمہ وقت کھلے ہیں جو انھیں شاعرہ یا ادیبہ بنا دیں۔ اس مقصد کے لیے بڑے بڑے ثقہ اور مشہور لوگوں کو نہایت بے تکلفانہ خطوط بھی لکھے جاتے ہیں جو وفات کے بعد منظر عام پر آ کر ان کی شہرت میں اور بھی اضافہ کرتے ہیں۔ اگر آپ اسے نسائی شعور کہتے ہیں تو مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔

ایک طویل عرصہ تک دنیا بھر میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا تھا۔ وہ ووٹ دینے کی بھی اہل نہیں تھیں۔ سعودی عرب میں آج بھی بعض معاملات میں خواتین پر پابندی ہے۔ آپ کے اپنے پاکستان کے شمالی علاقوں میں عورتیں آج بھی صرف استعمال کی چیزیں ہیں۔ لحاف گدوں اور گرم کپڑوں کی طرح جنھیں صرف ضرورتاً نکالا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ تعلیم نے لوگوں کے ذہنوں میں روشنی پیدا کی اور عورتوں کے بے مساویانہ حقوق حاصل کرنے کی کئی تحریکیں چلیں جن میں مختلف ادوار میں مختلف نام دیے گئے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں بہت سے مردوں نے فیمی نزم (Feminism) کی مخالفت کی وہیں بے شمار لوگوں نے اس تحریک کا بھرپور ساتھ بھی دیا اور تسلیم کیا کہ عورت ایک زندہ وجود ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی حیثیت مسلم ہے۔ وہ ایک مکمل اکائی بھی ہے اور مکمل خاندان بھی۔ روشن خیال لوگ جانتے تھے کہ فیمی نزم کی تحریک تنگ نظری نہیں بلکہ روشن خیالی ہے۔ مرد اور عورت باہم مل کر ایک دوسرے کے تعاون سے معاشرے میں خصوصاً ادب اور سیاست میں انقلاب لا سکتے ہیں۔

سماجی زندگی میں ادب کی اہمیت سے انکار نہیں

کیا جا سکتا۔ برصغیر میں نسائی ادب میں جن خواتین نے اپنا حصہ ڈالا اور خود کو منوایا ان کے پیچھے اور ان کے ساتھ ان کے گھر اور خاندان کے مرد بھی تھے۔علی گڑھ میں سب سے پہلا گرلز کالج ڈاکٹر رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ ہی نے قائم کیا تھا۔ جسے شاید مصلحتاً بھلا دیا گیا۔نسائی شعور کے حوالے سے بعض شاعرات نے ایسا ضرور کیا جس سے جلد مشہور ہوا جا سکے۔بعض افسانہ نگار خواتین نے بھی یہی شارٹ کٹ اپنایا لیکن ان سب سے قطع نظر ادب میں نسائی شعور کی بات تو اتر کے ساتھ اس لیے کی جاتی ہے کہ اردو ادب میں خواتین نے بہت جدوجہد اور محنت سے خود کو منوایا ہے لیکن اس کے پیچھے کوئی فیمی نزم وغیرہ کی تحریک کارفرما نہیں تھی۔

جب برصغیر کی خواتین نے ادبی میدان میں قدم رکھا تو ان کے پاس سماجی اور تہذیبی شعور تو تھا لیکن ان کے مشاہدات کی دنیا محدود تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ صرف گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں۔شرفاء میں لڑکیوں کی تعلیم بھی گھر پر ہی ہوتی تھی۔ جبکہ مردوں کے لیے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ بلکہ انھیں بند دروازوں تک بھی رسائی حاصل تھی۔ یہ وہ تہذیب تھی جہاں زنان خانے اور مردانے حصے الگ الگ اور فاصلے پر ہوتے تھے۔خواتین کو مردانے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جبکہ مردوں کا معاملہ دگر تھا۔ بیشتر آزادانہ طوائف کے کوٹھے پر بھی جاتے تھے۔بہت سے نکاح کے بغیر ہی باندیوں سے اولادیں بھی پیدا کر لیتے تھے۔لڑکوں کی مسیں بھیگتے ہی جہاں ان کی مونچھوں کے کونڈے ہوتے تھے وہیں بعض گھرانوں میں بزرگ خواتین جوان خادماؤں کو بہ اہتمام ان کے کمروں میں بھیجتی تھیں کہ صاحبزادے کے پاؤں بھی دبا دینا۔جبکہ لڑکیوں کو سات پردوں میں رکھا جاتا تھا۔ یہ وہ تہذیب تھی جس کے پروردہ حسرت موہانی بھی تھے اور انھیں اپنی چچازاد اور منگیتر کو دیکھنے کے لیے بھری دوپہر کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

لیکن انگریز کی آمد نے ہندوستان میں رہنے والوں کی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پہ اپنے اثرات مرتب کیے۔وہیں عورتوں میں بھی یہ شعور بیدار ہوا کہ وہ اپنی تعلیم پر توجہ دیں۔ بدلتے ہوئے حالات سے لوگوں نے سمجھوتہ کیا اور اپنی لڑکیوں کو انھوں نے اسکول، کالج اور یونیورسٹی بھیجنا شروع کیا لیکن اس عمل میں بھی مردان کے پیچھے تھے۔تعلیم نسواں کے شعبے میں شیخ عبداللہ کے کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔انھوں نے 1904ء میں لڑکیوں کا ایک اسکول علی گڑھ میں قائم کیا جو بعد میں ان کی اور ان کی اہلیہ کی کوششوں سے یونیورسٹی کے درجے تک جا پہنچا۔تو ایک طرح سے تو برصغیر میں نسائیت یا فیمی نزم کے اوّلین معمار مرد ہی ٹھہرے؟

اب آپ آجایئے ادب کی طرف تو سب سے پہلے لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت کا خیال بھی ایک مرد ادیب ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ہی کو آیا اور انھوں نے ہی سب سے پہلے ''مراۃ العروس'' لکھ کر اردو ناول کی ابتداء کی۔تعلیم نے عورتوں کو لکھنے کی طرف مائل کیا اور انھوں نے قلم کو بڑی مضبوطی سے پکڑا لیکن کچھ خوف، کچھ ڈر اور کچھ سماجی پابندیوں کی وجہ سے انھوں نے اپنی تخلیقات شوہر یا بیٹے کے نام سے شائع کروائیں۔ جیسا کہ اکبری بیگم نے والدہ افضل علی کے نام سے رشیدۃ النساء نے والدہ سلیمان کے اور نذر سجاد حیدر نے بنت نذر الباقر کے نام سے اپنی پہچان بنائی۔پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ خاص طور سے ناول نگاری کے میدان میں رشیدۃ النساء بیگم کے ناول ''اصلاح النساء'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی خالق کا نام بھی لوگوں کے سامنے آیا۔ان کے علاوہ محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر، بیگم ممتاز علی، عطیہ فیضی، صغریٰ ہمایوں، خجستہ اختر، کنیز فاطمہ، بیگم شاہنواز، طیبہ بیگم، ضیاء بیگم، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر رشید جہاں، شکیلہ اختر، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، حجاب امتیاز علی تاج، جیلانی بانو، رضیہ فصیح احمد، الطاف فاطمہ، جمیلہ ہاشمی، اختر جمال اور کشور ناہید تک پہنچتا ہے۔یوں تو دور جدید میں بھی خواتین نے نسائی شعور کی بھرپور ترویج و اشاعت کی لیکن میں اپنے مضمون کو قرۃ العین حیدر تک ہی محدود رکھوں گی۔ کیونکہ اردو ادب میں نسائی شعور کے احساس کی نمائندگی جس طرح رشیدۃ النساء سے لے کر قرۃ العین حیدر تک کے دور کی خواتین نے کی وہ بات آج ناپید ہے اور فرق ہے سوچ کا۔

فیمی نزم یا نسائیت کی سب سے بڑی پرچارک ڈاکٹر رشید جہاں تھیں لیکن ان سے پہلے ابتدائی دور میں جن تخلیق کار خواتین کا کام سامنے آتا ہے ان سب کے ہاں ایک احساس دردِ مشترک کے طور پر موجود ہے اور وہ ہے عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھنا لیکن ان خواتین نے عورتوں کی آزادی کا نہ کوئی جھنڈا لہرایا نہ ہی کوئی سیاسی گروپ تشکیل دیا۔ کیونکہ یہ خواتین بہت فہمیدہ اور سمجھدار تھیں اور جانتی تھیں کہ

آزادی کی لہر اپنے اپنے گھروں ہی سے اُٹھے گی۔ لہٰذا انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے ایجنڈے کو آگے بڑھایا اور تعلیم پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے لڑکیوں کو ازدواجی زندگی بہتر گزارنے کے طریقے بھی بتائے اور انھیں یہ احساس بھی دلایا کہ آزادی محض بے پردہ گھومنے، کلبوں اور ڈانس پارٹیوں کی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ آزادی کا مطلب ہے تعلیم حاصل کر کے بہترین ماں اور بہترین بیوی بننے کے ساتھ ساتھ اپنی ذہنی وفکری آزادی کو قائم رکھنا۔ اس دور میں محمدی بیگم کے ''گودڑ کا لعل''، ''سگھڑ بیٹی''۔ فاطمہ بیگم کے ''غیرت کی پتلی'' انوری بیگم کے ''روشنک بیگم'' نذر سجاد حیدر کے ''آہ مظلوماں، جانباز اور نجمہ۔ ایسے ناول ہیں جنھوں نے مسلم گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کے شعور کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

ترقی پسند تحریک کی روح و رواں ڈاکٹر رشید جہاں نے باقاعدہ ایک مینی فیسٹو کے ذریعے اپنے افسانوں میں اس تکلیف دہ صورت حال کو واضح کیا جس سے مڈل کلاس عورت خاص طور سے متاثر ہو رہی تھی اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ باقاعدہ ایک تحریک کے طور پر نسائیت کی علم بردار رشید جہاں ہی تھیں۔ ان کے بعد اس سلسلے کو جن خواتین نے آگے بڑھایا ان میں یوں تو بے شمار نام ہیں لیکن بطور خاص عصمت چغتائی، اے آر خاتون، حاجرہ اور خدیجہ، واجدہ تبسم اور قرۃ العین حیدر کے نام بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ عصمت نے ''معصومہ'' میں اور اپنے تقریباً تمام انسانوں میں ان رویوں کی مذمت کی ہے جو عورتوں سے بوجوہ روا رکھے جاتے تھے۔ عصمت نے طوائفوں اور گھریلو عورتوں دونوں کے درد کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اسی طرح واجدہ تبسم نے خالصتاً حیدر آباد گھرانوں کے اندر کی کہانیاں لکھیں لیکن قرۃ العین حیدر نے کسی خاص کی طبقے نمائندگی کرنے کے بجائے ان مجبور اور لاچار عورتوں کو اپنے ناول اور افسانوں کا موضوع بنایا جو ان کے اردگرد تھیں۔ ''گردش رنگ چمن'' میں دو شہزادیاں 1857ء کی جنگ کے بعد کس طرح مشہور طوائفیں بن گئیں۔ ''تار پر چلنے والی'' میں سرکس میں کام کرنے والی لڑکی کا دکھ قاری کو اپنا دکھ لگتا ہے۔ ''نظارہ درمیاں ہے'' کی پیرو جادستور افسانہ ختم ہونے کے بعد بھی قاری کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ ''اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے'' کی جمال آراء جو بونی ہے لیکن ایک دلکش آواز کی مالک ہے۔ اس کے عشق میں گرفتار نجن میاں برسوں آواز والی کے عاشق رہتے ہیں۔ وفادار شوہر بھی ہیں لیکن جادو بھری آواز کی مالکہ کا سحر جو طالب علمی کے زمانے میں ان پر طاری ہوا تھا وہ ایک دن یوں ٹوٹا کہ جب وہ جادو بھری آواز ان کے کانوں میں پڑی تو یہ دیکھ کر ان کی ساری محبت رفو چکر ہوگئی کہ وہ ایک بونی تھی جمال آرا۔ جو گانا گا کر بھیک مانگتی تھی۔ اسی طرح پت جھڑ کی آواز کی تنویر فاطمہ، سنگھار دان کی زمرد پری، حسب نسب کی چھمی بیگم، اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو کی قمرن اور جمیلن۔ ایسے کردار ہیں جو مکمل طور پر نسائیت کے دکھ کا احاطہ کرتے ہیں۔ متذکرہ بالا تمام خواتین نے اپنے کرداروں کے ذریعے عورت کو نڈر، جری، باہمت اور روشن خیال بنایا۔

لیکن اگر ہم موجودہ دور کو دیکھیں تو نسائیت صرف ایک نعرہ ہے جو بہت سے فائدے دلواتا ہے۔ خواہ سیاست ہو یا ادب۔ دونوں جگہ اب یہ صرف ایک نعرہ ہے وہ بھی اس لیے کہ مختلف مشاعروں اور کانفرنسوں میں ان کی شمولیت پکی رہے۔ کچھ پرائیویٹ ٹی وی چینلز عورتوں کی مظلومیت پر ڈرامے لکھوا کر دولت اکٹھی کر رہے ہیں۔ تو کچھ این جی او بھی یہ کاروبار بڑی چابکدستی اور مہارت سے کر رہی ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ سب دکھاوا ہے۔ صرف اپنے ذاتی فائدوں کی خاطر عورتوں کا نام بے شک بک رہا ہے۔ کیونکہ بعض این جی اوز صرف انھی چینلز کو پروموٹ کر رہے ہیں اور پیسہ دے رہے ہیں جو صرف عورتوں کی محرومی اور مایوسی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں لیکن کیا ان ڈراموں کی نام نہاد رائٹرز نے کبھی شمالی علاقوں کی ان عورتوں کی محرومیوں کو محسوس کیا ہے جنھیں نیلے برقعوں میں قید کر دیا گیا ہے؟ کیا ان کا دل قلم ہاتھ میں لینے کو نہیں چاہتا ہوگا؟ کیا ان کے زرخیز ذہن میں کوئی افسانہ پروان نہیں چڑھتا ہوگا؟ کیا شاعری کی دیوی ان پر مہربان نہیں ہوتی ہوگی؟ لیکن جہاں اسکولوں کو بم سے اُڑا دیا جاتا ہو، جہاں لڑکیوں کی تعلیم جرم ہو وہاں لفظ تانیثیت یا نسائی ادب کا حوالہ بہت مضحکہ خیز لگتا ہے۔ کم از کم پاکستان میں تو بالکل نہیں...... بڑے شہروں میں بھی صورت حال بہت زیادہ حوصلہ افزا کم از کم پاکستان میں تو نہیں ہے۔ البتہ بیانات کی حد تک ''سب اچھا ہے''

میری ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ یہ کہ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں ادب کو خانوں میں بانٹنے کی قائل نہیں ہوں...... لیکن ہمارے مرد ادیب خواتین لکھاریوں کو صرف چند موضوعات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی خاتون اگر جنس کے حوالے سے کوئی افسانہ لکھتی ہے تو فوراً ہی ایسے ریمارکس سننے کو

ملتے ہیں کہ......''لو خاتون ہو کر سیکس پہ لکھ رہی ہیں'' گویا سیکس کا ٹھیکہ ہمیشہ سے مردوں کے پاس تھا اور ہمیشہ رہے گا بھی انھیں کے پاس۔ کم از کم انڈیا پاکستان اور بنگلہ دیش کے حوالے سے۔ کیونکہ عورت کو کبھی ذہنی طور پر برابری کا درجہ دیا ہی نہیں گیا۔ برصغیر کے مرد نے خواتین کے لیے موضوعات کا تعین بھی خود ہی کر دیا ہے۔ خود ان کے لیے سارے میدان کھلے ہیں۔ جب چاہیں جہاں گھس جائیں کہ یہ ابن آدم ہیں۔ اسی حوالے سے دو واقعات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گی۔ 2000ء میں میرا ایک افسانہ شائع ہوا ''وارث'' جو بعد میں میرے اولین مجموعے'' گلاب زخموں کے'' میں بھی شامل تھا۔ اس افسانے کو لوگوں نے بہت تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایک مشہور مولانا نے جوٹی وی پر بھی اپنے جلوے بکھیرتے ایک پرچے کے مدیر سے کہا کہ ''اس افسانے میں تو کھلم کھلا بے راہ روی کی ترغیب دی گئی ہے'' میرے کالج کے ایک پروفیسر صاحب نے جو انگریزی ادب پڑھاتے تھے۔ انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ'' کوئی خاتون کیونکر اس موضوع پر قلم اُٹھا سکتی ہے'' انھوں نے اپنی تحریر و تقریر دونوں میں میری اس ''بے باکی'' کی طرف اشارہ کیا۔ حالانکہ ایسا کچھ نہ تھا لیکن جانے ان کے ذہنوں میں خود گلے تھے۔ جبکہ بات صرف اتنی سی تھی کہ ایک غریب عورت جو کسی مالدار چودھری کی دوسری بیوی ہے وہ بھی لگاتار تین بار بیٹیوں ہی کو جنم دیتی ہے لیکن چوتھی بار اس کے ہاں بیٹا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ بے گھر و بے در اور بے آسرا ہونے سے بچ جاتی ہے۔ بس یہی سارا دکھڑا تھا کہ بیٹا کیسے ہوا؟ بوجوہ میں نے یہ افسانہ اپنے نئے افسانوی مجموعے میں شامل کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھے اسی افسانے کے حوالے سے یاد رکھا۔ مسعود حسنین زیدی اور ان کی بیگم شاہین زیدی کے ہمراہ جب ہم دونوں میاں بیوی ان کے گھر عیادت کو گئے اور مسعود زیدی نے میرا تعارف کرایا تو انھوں نے لیٹے لیٹے کہا ''ہاں میں نے ''سیپ'' میں آپ کا افسانہ ''وارث'' پڑھا تھا۔ بہت اچھا اور پر تاثر افسانہ ہے۔''......دوسرا واقعہ بھی سن لیجے کہ 2012 میں ایک کالم میں نے تیسری جنس یعنی ہیجڑوں کی کسمپرسی پہ لکھنا۔ تب بعض لوگوں نے یہ ریمارکس دیے۔''ایسا لگتا ہے جیسے یہ بہت قریب سے انہیں جانتی ہوں خاتون ہونے کے ناطے انہیں یہ کالم کا موضوع نہیں بنانا چاہیے تھا'' جبکہ تیسری جنس کے مسائل اور بنیادی ضروریات کے حوالے سے لکھے گئے کالموں کو بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا لیکن ایک طبقہ ہمارے ہاں اب بھی طالبان سوچ رکھتا ہے۔

بات جب نسائیت یا فیمی نزم کی ہو تو اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عورتوں کو ادب میں روشناس کرانے کا سہرا دو مردوں کے سر جاتا ہے۔ اول ڈپٹی نذیر احمد جن کا ذکر ہو چکا اور دوسرے علامہ راشد الخیری، جن کو صحیح معنوں میں نسائیت کا علمبردار کہنا چاہیے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا تعلق پڑھے لکھے متوسط طبقے سے تھا۔ علامہ صاحب نے نسائیت کے حوالے سے جتنا ادب تخلیق کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی لیکن کیسا المیہ ہے کہ تقسیم سے پہلے مردوں میں اتنا شعور تھا کہ انھوں نے حالات کی نبض اور زمانے کی رفتار دونوں کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی خواتین کے لیے نہ صرف ادب کے دروازے کھولے بلکہ انھیں سہارا بھی دیا لیکن افسوس کہ آج پاکستان میں صورت حال پہلے جیسی نہیں۔ شاید ہم تاریکی کا سفر طے کر رہے ہیں۔ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے جا رہے ہیں۔ ادب صرف ادب ہے جو زندگی کا نباض اور عکاس ہوتا ہے اور زندگی مرد اور عورت کے اشتراک سے بارآور ہے۔ محض ایک نعرے کی خاطر اسے خانوں اور ڈبوں میں نہ بانٹئے۔ جس طرح سمندر کی لہریں صرف لہریں ہوتی ہیں اسی طرح ادب کو بھی وسعت، گہرائی اور پہچان کے لیے ایک ہی رہنے دیجیے۔ خدا نے مرد اور عورت کی تخلیق اسی لیے کی ہے کہ دنیا دونوں کے بغیر نامکمل ہے۔ زندگی صرف زندگی ہوتی ہے جس کے کرب اور حقیقتوں کا اظہار مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے طریقے سے کرتے ہیں۔ کیا ہم نے اتنی جلد محمدی بیگم، فاطمہ بیگم، عباسی بیگم، انوری بیگم، نذر سجاد حیدر کو بھلا دیا۔ جنھوں نے اپنے والد اور بیٹوں کی ہمت افزائی کی وجہ سے ادب میں نام کمایا۔ آج بھی اُردو ناول کی کوئی بھی تاریخ مندرجہ بالا خواتین کے ذکر کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔

نسائیت یا تانیثیت کا نعرہ محض نعرہ ہے۔ جو صرف انھیں سوٹ کرتا ہے جو مختلف این جی اوز کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے لگایا جا رہا ہے۔ ایسے نعرے مالی منفعت کے ساتھ ساتھ غیر ملکی دوروں، ادبی کانفرنسوں میں شرکت کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں سے ''ایوارڈ'' دلوانے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر کہوں گی کہ ادب زندگی ہے اور زندگی میں عورت اور مرد دونوں برابر کے حصے دار ہیں۔

عربی شاعری کے تراجم

ممتاز راشد لاہوری

ہماری قومی زبان ''اردو'' تین بڑی زبانوں کے امتزاج سے وجود میں آئی یعنی عربی، فارسی اور ہندی کے امتزاج سے۔ اردو زبان میں ترکی، پنجابی، انگریزی اور بعض دیگر زبانوں کے اسماء و الفاظ بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مگر زیادہ تر اردو تراجم انگریزی اور فارسی زبانوں کے تخلیقات وغیرہ ہی کے ہوئے ہیں۔ گاہے گاہے عربی زبان کے ادب پاروں کو بھی اردو ترجمے کا ملبوس پہنایا گیا مگر اتنا نہیں جتنا انگریزی اور فارسی تخلیقات کو۔

محمد احمد نے 2017ء میں ایک گرانقدر کاوش کی اور ''جدید عربی شاعری کے رجحانات'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں 1897ء سے 2017ء تک کی منتخب عربی شاعری کے وہ تراجم پیش کیے جو انھوں نے خود کیے تھے۔

محمد احمد نے ایم فل عربی کیا ہُوا ہے اور گورنمنٹ بوائز کالج گلبرگ لاہور سے وابستہ ہیں۔ 96 صفحات کی ان کی یہ کتاب آزاد بکڈپو چوک اردو بازار نے دسمبر 2017ء میں شائع کی تھی۔ میری ان سے زیادہ ملاقات حلقہ ارباب ذوق لاہور کے ہفتہ وار اجلاسوں، پاک ٹی ہاؤس میں ہوتی رہی اور مجھے انھوں نے اپنی یہ کتاب 23 جون 2018ء کو ''پلاک'' لاہور میں اس وقت عنایت کی جب ہم وہاں ادبی ماہنامہ ''بیاض'' کی سالانہ ایوارڈ تقریب میں جمع ہوئے تھے۔ میں بسلسلہ روزگار کوئی 37 سال تک ایک خلیجی عربی ریاست قطر میں مقیم رہا تھا اور اسی حوالے سے خلیجی ریاستوں کویت، بحرین، سعودی، دوبئی، ابوظہبی اور شارجہ وغیرہ بھی آنا جانا رہا ہے، تو انھیں پتہ تھا کہ عربی زبان سے بھی کچھ شدہ بدھ ہوگی، غالباً اسی وجہ سے محمد احمد نے اپنی یہ کتاب مجھے عنایت کی۔ قطر میں قیام کے دوران وہاں کے سرکاری تعلیمی ادارہ معہد اللغات (انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز) سے میں نے چار سالہ زبان عربی کا ڈپلومہ کورس مکمل کیا تھا اور اُسی دور میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے میں نے فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے ''زبان و ادب گروپ'' میں بی اے کیا، اس سے تین سال قبل نجی طور پر ایف اے کا امتحان بھی قطر میں دیا تھا اور عربی زبان کا مضمون بھی رکھا تھا۔ تب اردو کے پرچے سے زیادہ نمبر مجھے عربی کے پرچے میں ملے تھے۔ ''معہد اللغات'' میں عربی کورس کی نصابی کتب میں کچھ عربی شاعری بھی شامل تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک نظم ''الطفل الظریر'' بھی تھی یعنی ''اندھا بچہ''۔ اس نظم میں نظر کی روشنی سے محروم بچے کی کیفیات اتنے پُراثر طریقے سے بیان کی گئی تھیں کہ میں نے پھر اُس نظم کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا جو اُس دور میں ''نوائے وقت'' لاہور کے ہفتہ وار ادبی صفحے میں شائع بھی ہوا تھا۔ اب محمد احمد کی کتاب ''جدید عربی شاعری کے رجحانات'' دیکھی تو اپنی وہ کچھ کاوش بھی یاد آئیں جو اُس دور میں زبانِ عربی اور زبانِ اردو کے باہمی تعلق کے حوالے سے مجھ ناچیز نے کی تھیں۔ محمد احمد نے عربی سے اردو ترجمہ کرتے ہوئے ''منظوم ترجمہ'' کرنے کی بجائے ''نثری ترجمہ'' کی روش اپنائی ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اصل تخلیق کا زیادہ سے زیادہ مفہوم اس ترجمے میں مل جاتا ہے۔ (منظوم ترجمے میں شعریت کا عنصر اہم ہوتا ہے) محمد احمد نے اپنی اس کتاب میں کچھ قدیمی اور کچھ جدید عربی شعراء کے کلام کا انتخاب کر کے نثری اردو ترجمے کے ذریعے انھیں اہلِ اردو سے بہت اچھے انداز میں متعارف کرایا ہے۔ ان کی اس کتاب کے ابواب مضامین کی شکل میں ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین وہ ''حلقہ ارباب ذوق لاہور'' کے اجلاس میں پیش بھی کر چکے ہیں۔ ان مضامین پر جو تحسینی یا تنقیدی آراء ان اجلاسوں میں سامنے آئی تھیں، ان کے کچھ اثرات امکانی طور پر محمد احمد کی اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں جگہ پاسکتے ہیں، یہ اس لیے بھی ضروری ہوگا کہ کتاب کی موجودہ ضخامت (96 صفحات) اس موضوع کے اعتبار سے کم محسوس ہوتی ہے، یہ کم از کم سوا سو صفحات کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔ محمد احمد کی اس کتاب سے ہمیں بارہ عربی شعراء سے متعارف ہونے کا موقع ملا ہے، یہ ایک گرانقدر کاوش ہے، چراغ سے چراغ جلانے کی ایسی اور بہت سی کاوشیں سامنے آنی چاہیں اور عربی زبان کے ادب کے حوالے سے اردو تراجم کی تو زیادہ کتب سامنے آنی چاہیں تاکہ ان دونوں عظیم زبانوں کا ادب ہر جگہ متعارف ہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ محمد احمد کی اس کتاب میں زیادہ شعراء کا تعلق لبنان سے اور پھر اُس سے متصل ممالک فلسطین اور مصر سے ہے، ممکنہ طور پر ایسی اگلی کتب میں سرزمین عرب کے دیگر ممالک بھی نمایاں نمائندگی ملنی چاہیے تاکہ ایک مجموعی تصویر کے نقوش ابھر سکیں۔ محمد احمد کی اس پُرمغز کاوش کی کھلے دل سے تحسین ہونی چاہیے۔ میں بھی کھلی باہوں سے اس اہم کتاب کا استقبال کرتا ہوں۔

نظری، اطلاقی اور نقد الانتقادی تنقید

ازور شیرازی/سرگودھا

تنقید کی بنیادی طور پر تین اِقسام نظری تنقید ،اطلاقی تنقید اور نقد الانتقادی ہیں۔مقدم الذکر نظری تنقید اُن اصول ،نظریات اور طریقہ ہائے کار سے عبارت ہے جو ادب کی تفہیم و تعبیر کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ادب کی تشریح و توضیح کے لیے بنائے گئے پیمانوں کو فن پارے پر منطبق کرنا اطلاقی تنقید کے زمرے میں آتا ہے۔نقد الانتقادی تنقید ،نظری تنقید کے وسیلے سے ہونے والے اطلاق کی محاکمہ سازی کر کے بتاتی ہے کہ اطلاقی تنقید کس حد تک کامیاب ہوئی ہے اور کہاں کہاں کون کون سی کمیاں موجود ہیں۔نظری تنقید ادبی اور غیر ادبی نظریات سے تشکیل پاتی ہے۔بعض اوقات سائنس،فلسفہ ، تاریخ، نفسیات،عمرانیات اور طبیعات کے میدان میں بڑے نظریات کی آمد ادبی منظر نامے پر بھی اثرات مرتسم کرتی ہے۔ایسے نظریات کا ادب سے براہِ راست تعلق نہیں ہوتا۔تاہم اُن کے ہمہ گیر اثرات کے باعث ادبی افق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔اِس ضمن میں کارل مارکس ،ایڈلر یونگ اور فرائیڈ کی مثالیں نمایاں ہیں۔مذکورہ شخصیات کا ادب سے راست تعلق نہیں تھا۔یہ الگ بات کہ انھوں نے ادب پر جزوی نوعیت کی خامہ فرسائی کی۔لہٰذا ایسے تصورات کا فن پاروں پر اطلاق موضوعاتی اشتراک کی صورت میں کیا جاتا ہے۔یعنی جن متون میں مارکس کے معاشی ،یونگ کے اجتماعی لاشعور اور فرائیڈ کے تحلیلِ نفسی کے عناصر موجود ہوں اُن کی تعینِ قدر کرنا۔یہاں اِس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ غیر ادبی علوم کے نظریات کا ادب پر اِنطباق موضوع کی سطح تک ہوتا ہے۔یہ نظریات ادب کی جمالیات پر نہ ہی بات کرتے ہیں اور نہ ہی نظر انداز۔لہٰذا یہ ماننا کہ دیگر علوم کی تھیوریوں کا ادب پر اطلاق ،ادب کی جمالیاتی زیب و آرائش کو منہدم کرنا ہے بے بنیاد ہے۔دوسری بات علمی تصورات کو ادب میں متعارف کروانے والے ناقدین اِن کی علمی نوعیت پر بالتفصیل بحث نہیں کرتے کیونکہ وہ تو اُن نظریات کے خالق اور اُس دائرہ علم کے مفکر بہتر انداز میں کر چکے ہوتے ہیں۔ادبی نقاد تو اُن نظریات کے اثرات کا ادب سے تعلق واضح کرنے کی صورتیں نکالتا ہے۔علمی نظریات کو ادبی تھیوری اور طرزِ تنقید بنا کے علم و ادب میں ہم آہنگی قایم کرتا ہے۔تاہم دونوں میں غالب عنصر علمی نظریے کا ہی ہوتا ہے۔علمی نظریے پر پروان چڑھنے والی نظری تنقید کا اطلاق نظریاتی جبر کی صورت اختیار نہیں کرنا چاہیے۔وہ ایسے کہ جن متون کے باطن میں جس علمی رویے کے عناصر بکھرے ہوئے ہوں اُن پر اُسی نظری تنقید کا اطلاق کیا جائے۔عناصر کی عدم موجودگی میں کیا گیا اطلاق کبھی سود مند ثابت نہیں ہوسکتا۔نظری تنقید کی دوسری صورت ادبی تھیوری ہے۔ادبی تھیوری ادب کے تخلیقی ،فنی اور فکری پہلوؤں کا احاطہ ضرور کرتی ہے؛ کیونکہ ادبی تھیوری سے توقع ہی یہی کی جاتی ہے۔ادبی تھیوری طبع زاد یا پہلے سے پیش کی گئی کسی ادبی تھیوری کا ردِ عمل بھی ہوسکتی ہے۔ادبی تھیوری طبع زاد یا ردِ عمل دونوں صورتوں میں پہلے سے موجود تصورات سے غیر مطمئن ہوتی ہے۔وہ انھیں قدم تصورات سے رہائی دلا کے اپنے بنائے گئے اصولوں میں قید کر دیتی ہے۔وزیر آغا نے اپنی کتاب "دستک اُس دروازے پر' میں درست کہا تھا کہ "ہر آزاد عمل سابقہ پابندی کو توڑ کر اپنے گرد ایک نئی پابندی کا ہالہ تعمیر کرتا ہے یہی فن کا چلن ہے"(۱) تاہم نظری تنقید کی ادبی اور غیر ادبی دونوں تھیوریوں کا ادب کے ماحول،ثقافت اور مزاج سے مناسب انسلاک ضروری ہے۔وگرنہ اُن کا ادب میں رائج ہونا خطرے سے خالی نہیں۔وارث علوی کی رائے ہے:

"ادب کی نظری تنقید کی تعمیر بھی ادب کی تجربی سطح پر نہ کی جائے تو وہ اِس قدر تجریدی اور تعمیمی ہو جاتی ہے کہ معاشرتی نقادوں کا مضمون سماجیات بن جاتا ہے اور فلسفیانہ خیالات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتاب یا تو تاریخ کی دستاویز بنتی ہے یا افکار کی تاریخ۔ایسی کتابوں کی عالمانہ وقعت اپنی جگہ لیکن وہ بنیادی طور پر ادبی تنقید کی کتابیں نہیں ہوتیں کیونکہ اُن میں ادب کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے"(۲)

اطلاقی تنقید نظری تنقید کا عملی اظہار ہونے کے باعث نظری تنقید کے ماتحت رہتی ہے۔وہ نظری تنقید کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتی کیونکہ اُس نے نظری تنقید کے بتائے ہوئے راستوں پر ہی سفر کرنا ہوتا ہے۔تھیوری کی بہتات کی وجہ سے تو نظری تنقید کا آپسی تعلق اور مضبوط ہوگیا ہے۔تھیوری کے مخالف

اطلاقی تنقید کو بغیر کسی دلیل کے نظری تنقید سے الگ اور برتر بھی سمجھتے رہے۔اُس کی وجہ یہ ہے کہ تھیوری مخالف نئے نظریات کو اِس لیے پسند نہیں کرتے کہ انھیں دوسروں نے پیش کیا ہوتا ہے یا پھر وہ اپنے پرانے نظریات کا تحفظ چاہ رہے ہوتے ہیں۔(۳)تھیوری مخالفت کا یہی جذباتی رویہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب" عملی تنقیدیں" میں یوں عکس ریز ہوا ہے:

' عملی تنقید کا کام نظری تنقید کے مقابلے میں نسبتاً مشکل ہے وجہ یہ ہے کہ نظری تنقید عموماً دوسروں کے اقوال و افکار اور خیالات و نظریات یا خارجی مصادر و ماخذ کو رہنما بنا کر آگے بڑھتی ہے اور بسا اوقات دیکھا یہ گیا ہے کہ اِس طرزِ عمل سے بات سلجھنے کے بجائے مزید الجھاؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔اس کے برعکس عملی تنقید میں اپنے زیرِ قلم موضوع اور مواد کے بارے میں براہِ راست گفت گو کرنا پڑتی ہے اور فکر و فن کے بارے میں دوٹوک رائے دینا ضروری ہو جاتا ہے "(۴)

محولا بالا رائے سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ عملی تنقید کو سماجی علوم سے جدا سمجھا گیا ہے۔فرمان فتح پوری نے جو براہِ راست ادب سے گفت گو کرنے والی تنقید کو فوقیت دی ہے؛ وہ بھی تو کسی نہ کسی تصور،نظریے سے مستعار ہے۔اُن کے اِس طرزِ تنقید کو نظری تنقید اور تھیوری سے الگ نہیں مانا جا سکتا۔فن پارے کی روایت،زبان اور اُس میں رونما ہونے والی تبدیلیاں کئی علوم اور نظریات سے لازمی متاثر ہوتی ہیں۔لہٰذا یہ ماننا کہ فن پارے پر دی گئی فوری دوٹوک رائے کسی تھیوری یا عہد سے جدا ہے کسی صورت ممکن نہیں۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر تھیوری سے انحراف کرنے والے قارئین کو جواب دیتے ہیں:

"جو لوگ تھیوری کو ناپسند کرتے ہیں یا اس کے بغیر بہتر طور پر کام چلا لینے کا دعویٰ کرتے ہیں،وہ کسی پرانی تھیوری کی جکڑ میں رہتے ہیں۔۔۔کسی قسم کی تھیوری کے بغیر خواہ وہ مبہم اور مضمر ہی کیوں نہ ہو ہم یہ نہیں جان سکتے کہ ایک ادب پارہ ہوتا کیا ہے اور اِسے ہم کیسے پڑھیں۔تھیوری کی عداوت کا عام طور پر مطلب دوسرے لوگوں کی تھیوریوں کی مخالفت اور اپنی تھیوریوں کی فراموش گاری ہوتا ہے۔اُردو میں تھیوری کی مخالفت اُن لوگوں نے خاص طور پر کی جنھیں اپنی تھیوری پر شدت سے اصرار ہے مگر اُسے وہ تھیوری کا نام نہیں دینا چاہتے"(۵)

تھیوری کے تحت فن پارے کو دیکھنے سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری رناقد کے ہاتھ بنیادی نکات آجاتے ہیں۔نکات کو ترتیب وار ادب پارے پر منطبق کر کے دیکھتے جانے سے منضبط اور مربوط نتائج برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ایسے تنقیدی عمل کے دوران کسی طرح کی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔بصورتِ دیگر کسی واضح تھیوری کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے مطالعہ بے ترتیبی اور کئی متضاد بیانات کا ملغوبہ بننے کا خدشہ ہوتا ہے۔یوں جب نقاد کا تحریری اظہار ہی بے ربط ہوگا تو ادب کے قارئین اُسے کیسے پڑھ اور سمجھ پائیں گے۔نظری تنقید کے اطلاقی عمل کے حوالے سے یہ بات بتانا بھی ضروری ہے کہ اطلاق کرنے والے نظری تنقید کے سارے پہلوؤں کا بعینہٖ اطلاق نہیں کرتا۔اُس نے جتنا تھیوری کو پڑھا، جانا اور سمجھا ہوتا ہے وہ اُسی بساط کے مطابق اطلاقی عمل سرانجام دیتا ہے۔تبھی اطلاقی تنقید کو نقد الانتقادی تنقید سے پرکھا جاتا ہے کہ نقاد کا مطالعہ اور سوجھ بوجھ دیکھی جا سکے۔نقدالانتقادی نقاد نظری مباحث کی فہم اور اطلاقی تنقید کے نمونے دیکھ کر زیادہ محنت اور احتیاط سے کام لیتا اور رائے دیتا ہے۔نقدالانتقادی نقاد یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ مطالعہ کے تحریری اظہار میں نقاد کے اپنے تاثرات بھی لامحالہ طور پر در آتے ہیں۔یہ تاثرات نظری تنقید سے موافق،مخالف،امتزاج یا تشریح و تعبیر کے حوالے سے بھی ہو سکتے ہیں۔نقدالانتقادی نقاد تاثرات کی نوعیت سے نقاد کی ذہنی ساخت،شخصیت اور تنقیدی اہلیت کا اندازہ لگاتا ہے۔بعد ازاں نقدالانتقادی تنقید کو دوسرے نقاد بھی اسی زاویے سے دیکھتے رہتے ہیں۔ادب کی تفہیم،تعبیر اور تعینِ قدر کے حوالے سے کوئی بھی تھیوری ادب کے کُلی مطالعے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ہر تھیوری اپنے بیان کیے گئے مفروضات کی عینک سے نکالے گئے نتائج کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔تبھی تنقید میں ہر تھیوری کے ایک فن پارے کے متعلق حاصلات مختلف ہوتے ہیں۔کسی بھی ایک تھیوری سے نکالے گئے نتائج کو حتمی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ تنقید سائنس نہیں ہوتی۔تھیوری کی تعریف ہی یہی ہے کہ وہ اپنے زاویے سے منظم خیالات کا اطلاق کر کے دیکھتی ہے۔تھیوری کے اِس مختلف النوع نتائج کو معیوب نہیں سمجھا جا سکتا۔متعدد رویوں اور حاصلات سے ہی ادب کی رنگا رنگی قایم و دائم رہتی ہے۔تھیوری کے متنوع کمالات کی بابت شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

" کوئی بھی تنقیدی نقطۂ نظر سو فیصدی صحیح نہیں ہو سکتا،جس طرح کوئی بھی سائنسی یا فلسفیانہ نظریہ سو فی

صدی صحیح نہیں ہوسکتا۔سائنسی علم کے بارے میں تو پھر بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حقائق وشہادت کی روشنی میں یہی نظریہ درست ہے لیکن ادبی نقطہ نظر کے بارے میں اتنا بھی کہنا ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ ادب بذاتِ خود اِس قدر داخلی اور انسان کے ناقابلِ تجزیہ تصورات سے اِس قدر پیوست ہوتا ہے کہ اِس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی"(۶)

تنقید کا تعلق صرف ادبی فن پارے سے نہیں ہوتا۔تنقید زندگی کے تمام مظاہر کو دیکھنے، سمجھنے، پرکھنے اور رائے دینے سے عبارت ہے۔تھیوری بھی تنقید کی طرح صرف ادب سے سروکار نہیں رکھتی۔تھیوری کا دائرہ کار بھی ہر علم، فکر، تصوراور زاویے سے وابستہ ہے۔تھیوری کسی بھی پہلو سے دیکھ کر اُس کے ممکنات کی تشریح کرتی ہے۔تبھی تھیوری اپنی اصل میں فقط تنقید نہیں ہوتی۔البتہ تنقید کی بنیاد تھیوری سے مضبوط ہوتی ہے نیز رائج تھیوری کے بغیر تنقید کی بھی کوئی تھیوری نہیں بن پاتی(۷)۔اطلاقی تنقید کا رشتہ بھی صرف ادبی فن پاروں سے نہیں ہوتا۔سائنس کے کسی نظریے کا تجربہ کر کے کامیاب ہونا، نفسیات کے کسی تصور کا ڈیٹا اکھٹا کر کے نتیجہ نکلنا اطلاقی تنقید ہی ہے۔یہ الگ کہ ہر میدان میں اطلاق کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔علاوہ ازیں نقدالانتقادی تنقید بھی ادب کے علاوہ ہر دوسرے علم کے شعبے میں موجود ہے۔غرضیکہ تھیوری، تنقید، نظری تنقید، اطلاقی تنقید اور نقدالانتقادی تنقید زندگی کے ہر شعبے میں اپنی نمایاں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

حوالہ جات

۱۔وزیر آغا، دستک اُس دروازے پر، لاہور: مکتبہ فکر وخیال، ۱۹۹۳ء، ص:۱۳۲

۲۔وارث علوی، خندہ ہائے بے جا، کراچی: آج پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص:۱۰۹

۳۔ناصر عباس نیّر، عالم گیریت اور اردو اور دیگر مضامین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۱۱۲

۴۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری، عملی تنقیدیں، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص:۷

۵۔ناصر عباس نیّر، عالم گیریت اور اردو اور دیگر مضامین، ص:۱۱۰

۶۔شمس الرحمٰن فاروقی، کیا نظریاتی تنقید ممکن ہے؟، مشمولہ: تنقید کی جمالیات (جلد اول)، مرتّب: پروفیسر عتیق اللہ، لاہور: بک ٹاک پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص:۲۰۲

۷۔فہیم اعظمی، تنقید کی اصطلاح کا اطلاق، مشمولہ: تنقید کی جمالیات (جلد اول)، مرتب: پروفیسر عتیق اللہ، ص:۷۴

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلباء اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دوسوسالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق وتنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

چھین لیا ہے تم سے اسلم جیسا یار درختو!

عمران شناور/لاہور

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشا ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

یہ شعر بشیر بدر نے ایسے شہرت یافتگان کے لیے کہا ہوگا جو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتے اور شہرت کے نشے میں اپنا آپ بھول جاتے ہیں۔ ان کے مزاج سے انکساری رخصت ہو جاتی ہے اور خود نمائی کا وفور انہیں اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو پردۂ سکرین پر رکھنے کے لیے مرے جاتے ہیں۔ ہر کس و ناکس کو اپنا تعارف کراتے پھرتے ہیں۔ اور ایسا تب تک ہوتا ہے جب تک وہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کر لیتے۔ دراصل وہ شہرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے شہرت زندگی کی حیثیت رکھتی ہے اور گمنامی موت کی۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوتے ہیں۔ بقول نواب مصطفےٰ خان شیفتہ:

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گمنامی میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ لوگ ان کے کام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ان کو اپنا آپ دکھانے یا بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کا کام ان کو مقبول و معروف کرتا ہے اور وہ مقبولیت کا درجہ پاتے ہیں۔ شہرت ان کے قدم چومتی ہے۔ ایسے لوگ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان میں ایک نام جناب اسلم کولسری کا بھی ہے۔

جناب اسلم کولسری سے زیادہ اور پرانے تعلقات تو نہیں تھے لیکن چند ملاقاتیں ہی میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ ۲۰۰۹ء میں جب ثناء اللہ شاہ صاحب نے ادبی تنظیم روش کے زیر اہتمام پہلا سی ڈی مشاعرہ برپا کیا تو اس کی نظامت اسلم کولسری صاحب کے سپرد ہوئی۔ اس وقت میں تنظیم کا فنانس سیکریٹری تھا۔ اسلم کولسری صاحب نے مشاعرہ شروع ہوتے ہی اپنی غزل پیش کی:

ہجر کے جنگل میں آئی ہے پہلی رات درختو
کتنا سناٹا ہے چھیڑو کوئی بات درختو
ساری عمر کھڑے رہتے ہو تم بانہیں پھیلائے
کب اور کس جانب سے آتی ہے خیرات درختو
میں نے کتنی باتیں کی ہیں لیکن تم نہیں بولے
ہاں ہاں کیا اسلم کیا اسلم کی اوقات درختو

ان کے بعد بہت سے شعرا کرام نے کلام پیش کیا لیکن یہ غزل میرے ذہن پر نقش ہوگئی۔ ہر وقت یہ غزل دل و دماغ کے نہاں خانوں میں گونجتی رہتی اور یہ سلسلہ تب تک چلا جب تک میں نے خراج تحسین کے طور پر خود غزل نہیں کہہ لی۔

کیا محسوس کیا تھا تم نے میرے یار درختو
تنہائی جب ملنے آئی پہلی بار درختو
ہر شب تم سے ملنے آ جاتی ہے تنہا تنہا
کیا تم بھی کرتے ہو تنہائی سے پیار درختو
تنہائی میں بیٹھے بیٹھے اکثر سوچتا ہوں میں
کون تمہارا دلبر، کس کے تم دلدار درختو
لڑتے رہتے ہو تم اکثر تند و تیز ہوا سے
تم بھی تھک کر مان ہی لیتے ہو گے ہار درختو
اب کے سال بھی پت جھڑ آئے گا یہ ذہن میں رکھو
اتنا خود پر کیا اِترانا سایہ دار درختو
خود تم دھوپ میں جھلس رہے ہو مجھ پر سایہ کر کے
یہ ہے سیدھا سیدھا چاہت کا اظہار درختو
میں جب اپنے حق میں بولوں تم ناراض نہ ہونا
غیروں سے ہمدردی کرنا ہے بیکار درختو

اسلم کولسری صاحب سے فیس بک کے ذریعے ملاقات رہتی تھی۔ ان کو میں نے اپنی غزل پڑھائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے داد و تحسین سے نوازا۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی تو میں نے یہ غزل اپنے مجموعہ کلام ''ابھی مت ٹوٹنا اے خواب میرے'' میں شامل کر لی جو ۲۰۱۳ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

اکثر ان کا کلام پڑھنے کو دل کرتا تو فیس بک پر فرمائش کر دیتا اور وہ نہایت محبت کے ساتھ مطلوبہ غزل پوسٹ کر دیتے جس سے میری خوشی دیدنی ہوتی۔ موبائل پر بات ہوتی تو بہت محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتے اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے۔ جناب سرور ارمان کی اسلم کولسری صاحب سے دیرینہ دوستی تھی۔ میری اور سرور ارمان صاحب کی خواہش تھی کہ کسی روز وقت نکالیں اور بھرپور گفتگو کا موقع میسر آئے۔ ہم نے اکثر ان سے ملاقات کا پروگرام بنایا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی کام آڑے آ جاتا اور ہماری خواہش ادھوری رہ جاتی۔

ان کے وصال کی خبر سنی تو دل بیٹھ گیا۔ میں سارا دن ان کے لیے افسردہ رہا۔ پھر میں نے درختو والی زمین میں دو تازہ شعر سرور ارمان صاحب کو سنائے جو انہوں نے پسند بھی کیے اور غزل مکمل کر کے ارشد نعیم صاحب کو ادب دوست کے اسلم کولسری نمبر کے لیے بھیجنے کی تاکید کی۔ غزل تو مکمل نہ کر سکا لیکن سوچا کچھ تو خراج تحسین پیش کیا جائے کہ وہ میرے بھی محبوب تھے۔

وقت نے آخر کر ہی ڈالا کاری وار درختو
چھین لیا ہے تم سے اسلم جیسا یار درختو
تم سے باتیں کرنے والا، نظمیں کہنے والا
وہ تھا میرے شہرِ سخن کا اک سردار درختو

آخر میں اسلم کولسری صاحب کے چند لازوال اشعار قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر جو انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

میں نے اپنے سارے آنسو بخش دیئے
بچے نے تو ایک ہی پیسا مانگا تھا
شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
یار کو دیدۂ خونبار سے اوجھل کر کے
مجھ کو حالات نے مارا ہے مکمل کر کے
یعنی ترتیب کرم کا بھی سلیقہ تھا اسے
اس نے پتھر بھی اٹھایا مجھے پاگل کر کے
اسلم بڑے وقار سے ڈگری وصول کی
اور اس کے بعد شہر میں خوانچہ لگا لیا
درس و تدریس، عشق، مزدوری
جو بھی مل جائے کام کرتا ہوں
ایسا نہیں کہ دستِ دعا بے اثر گیا
کشتی کا ڈوبنا تھا کہ دریا اتر گیا

لبنیٰ صفدر/لاہور

دل نے پھر یوں تری آواز سنی ہو جیسے
قریۂ جاں میں کوئی یاد ہنسی ہو جیسے

اس طرح عشق سلگتا ہے بدن میں میرے
خیمۂ جاں میں کہیں آگ لگی ہو جیسے

اکثر اوقات مجھے بھیڑ میں یوں لگتا ہے
میری تنہائی مجھے ڈھونڈ رہی ہو جیسے

یوں جدائی میں تری ہم تو جیے جاتے ہیں
تجھ سے ملنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے

جس طرف دیکھوں نظر آتا ہے چہرہ تیرا
تیری تصویر نگاہوں میں بسی ہو جیسے

آج کہتی ہیں جدائی میں سلگتی آنکھیں
کوئی چنگاری ترے دل میں دبی ہو جیسے

مختصر اتنے تھے پل وصل کے لبنیٰ صفدر
اُس کا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے

درمیاں پردہ نہ پھر کوئی بھی حائل رکھا
اس طرح چاہا اُسے خون میں شامل رکھا

اک اشارہ تھا کسی آنکھ کے رستے جیسا
ایک چہرہ تھا جسے حاصلِ منزل رکھا

جب جواں ہونے لگی پاؤں کو زنجیر کیا
نام جس لڑکی کا ماں باپ نے پائل رکھا

اُس نے کشکول میرے ہاتھ کو بننے نہ دیا
ایک در کا میرے رب نے مجھے سائل رکھا

ایک ہی خواب دریچہ تھا جہاں پر لبنیٰ
اپنی آنکھیں بھی وہیں رکھیں، وہیں دل رکھا

نامور شاعرہ لبنیٰ صفدر کا چھٹا شعری مجموعہ
''تم محبت کا استعارہ ہو''
صفحات: 176 قیمت: -/400
اہتمام: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
0300-4489310

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلہ
الحمراء
ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں
رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

ساہواں تے دریاواں چ ٹُردیاں نظماں

نجم الحسنین حیدر

ہور نیں گلاں گلڑیاں، اللہ اللہ دی گل
کجھ رولا پایا عالماں، کجھ کاغذاں پایا جھل
(بابا بُلھے شاہؒ)

جانِ مَن! میں کدی وی ایڈا بے باک ہو کے ایس لکھت دا مڈھ نہ بنھدا پر انجینئرَ ظفر محی الدین ہوراں دی تیجی کتاب ''بھانبڑ وچ سریں'' چوں پھٹیاں چنگاں نیں میرا تن من پھوک چھڈیا اے -----کیہ کراں؟

جانِ مَن ------ محبت ای کائنات دا جوہر اے ------محبت ای ساریاں کتاباں تے عقیدیاں دا سَت اے، محبت محبت اے ------ بھاویں مجازی ہووے یا حقیقی ------ ''دِتے صورت راہ بےصورت دا'' محبت دا ای کمال اے۔

جانِ مَن! ''بھانبڑ وچ سریں'' جدید پنجابی آزاد نظم دی پہلی کتاب اے جیہڑی اِک نروئے فارمیٹ چ اَلفوں یے تک محبت دے آل دوالے ای جھمر پاوندی اے ------محبت جیہڑی ہجر چ وصال تے وصال چ ہجر دا درد تے نشہ عطا کردی اے۔ محبت جیہڑی نقطہ نقطہ اِک دوجے نال جُڑ کے اَلف بن جاندی اے ------الف جیہڑا متھے مروڑی پا کے میم ہو جاندا اے ------الف جیہڑا روپ وٹا کے ------ ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، ح، خ، ع، غ، ق ------ باقی سارے اَکھر اکھان تے فِر کل جہان بن جاندا اے ------ ایسے سرمستی چ انجینئرَ ظفر ہوریں لکھدے نیں۔

پا پیلاں نال سجن دے
بن سسّیوں خوب سیانی توں
دھر عشق دی پوڑی سب اپنا
لاٹھ کا کر راضی گُر اپنا
بہہ پینگھ تے کر موجاں
پڑھ ہر ویلے صلّی علیٰ
چھڈ نقلاں پھڑ اصلاں نوں
بن وو ہٹی چڑھ کھارے
ایہہ وقت نہ ہوسی کل جھلیے
لاٹھونگا اَمب نوں چکھ کڑیئے
(نظم ------''اَمب نوں چکھ کڑیئے'')

جانِ مَن! روح اللہ حضرت عیسیٰؑ دے ظہور توں وی پہلوں میری دھرتی دی زبان پنجابی چ دنیا دی ہر وڈی زبان توں وڈیاں ادبی کتاباں ایسے لئی ملدیاں نیں ------کیوں جے ------ مڈھوں ساڈا دُکھ، سُکھ، دوا، دارو تے موضوع محبت ای رہی اے ------ ایہو راز ڈاکٹر اقبالؒ دا پیامِ مشرق اے ------ جہان لئی Eastern Wisdom اے۔

جانِ مَن! ------ اساں محبت دے لکھاں روپ وٹائے ------ساڈیاں مُحبتاں، کہانیاں، کافیاں، قصیاں، گیتاں، جگنیاں، واراں، مثنویاں تے دریاواں دے پانیاں چ اَج وی زندہ نیں ------ محبت ساں، محبت ای رہے۔ اَج مشیناں، حدّوں بے حد آزادیاں، Psycho Analysis, Neuro Linguistic Programming تے Post Modern ادبی زمانے چ وی اسیں محبت ای پینڈے پلاوندے آں۔ ساڈا مرنا جینا ------ محبت سی، محبت ای رہوے گی۔

رکھ صاف زبان تے اَکھ روشن
چکھ عشق دا سالن ہَت پیارے
انجینئرَ ظفر محی الدین

جانِ مَن! ''بھانبڑ وچ سریں'' جدید پنجابی آزاد نظم دا اوہ نواں روپ اے جیہڑا صدیاں توں سارنگیاں، الغوزیاں، بانکیاں ٹیاراں تے رانجھناں دے ساہواں چ گھل دا رہیا ------ پر ------ صوفیاں تے قلندراں تے پورا اکھل داوی رہیا ئے۔ ایہہ دھرتی دی تاثیر تے مولا علیؑ مشکل کشا شیرِ خدا دی محبت دا کمال اے کہ انجینئرَ ظفر محی الدین جنھاں انجینئرنگ ورگی اعلیٰ تعلیم حاصل کیتی، بوہت سارے مُلکاں چ گھم پھرے، سیر سپاٹے کیتے، وَن سوَنیاں ملٹائی نیشنل کمپنیاں تے سرکاری محکمیاں چ وڈھیاں سیٹاں دا بھار چکیا، ہُن وی چکی پھردے نیں ------پر ------ اَج وی اوہناں نوں ------ ٹاہلیاں، بوڑھ، پپل، چن، چاننیاں تے تھڑیاں نوں بھلنا ------عشق چ کافر ہونا جاپدا اے ------اوہ اَج وی آکھدے نیں!

کسے دن ٹیم تے کڈھ
رَل مِل گلاں کریئے
سارے دی گرمی اندر

کھارے پانی ڈونگھا تریئے
بہہ اِک دوجے دے نیڑے
دُکھ محبت کٹھا جریئے
چل اوس کالے ڈھابے تے
وچوں باہروں پورا سریئے
آ ------اج ساون مہینے سجنا
دم عشق دا رج رج بھریئے
نظم ------''کھارے پانی''
(انجینئر ظفر محی الدین)

جان مَن! حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ آکھدے نیں!

''میرا دِل ہر اِک روپ دا بہروپ اے۔ ہرناں لئی چراگاہ، عیسائی راہباں دی خانقاہ، بتاں لئی مندر تے حاجیاں دا کعبہ اے، توریت دی تختی تے قرآن دا مصحف اے۔ میں عشق مذہب دا مانی ہاں---ایہہ مینوں جتھے چاہوے لے جاوے۔ میرا مذہب تے میرا عقیدہ اِک سچا مذہب اے''۔

جان مَن ------ ایس نظر نال ویکھیے تے سلسلہ عالیہ قادریہ نوشاہیہ، سچیاریہ دے اکابر اولیا اللہ دی وراثت دی مسند تے بیٹھا اِک درویش ------ بدوبدی ------ گھونگھٹ پاوندائے ------پَر------لُک نہیں سکدا ------ لُک سکدا ای نہیں ------ انھیرے چ لوواں تے سجناں چ خشبواں کیویں لُک سکدیاں نیں ------

روپ بہروپ پچھانے گئے
بہہ رلے کملے لوکاں وچ
کردتا پاگل عشقے نیں

نچ آن دوآرے گروآں دے
ذات نے قیدی سُر بنھیا
سُر بانگ سنائی درشن دی
چک بوجھ بیگانے سر اپنے
اُکھ گیڑے پندھ نویں نویں
اِک تن ہتھ پوری منجھی لئی
کیہ ساک سہیڑے بندیاں نیں
نظم----''نچ آن دوآرے گروآں دے''
(انجینئر ظفر محی الدین)

جان مَن! سچ پچھو تے ایہہ کسے انجینئر دی نہیں اِک باہوش ملنگ دی شاعری اے ------ دھمال وانگوں دِل چ اتر دی شاعری ------ پنجابی آزاد نظم نوں ازلاں دے گھوہڑے رنگ چ رنگدی ------ٹیم کڈھ کے لاٹھونگا امب نوں چکھدی شاعری ------اے۔

دھن بھاگ ------ پنجاب دی دھرتی دے جیہڑی اَج وی اجیہے پُت جمدی اے جیہڑے ایہدے وچ اُگدی ہر بوٹی دا میل ''الف اللہ چنبے دی بوٹی'' نال کرواکے ------اَج دیاں وحشت ناک تنہائیاں نوں میلے چ تبدیل کر دیندے نیں۔

نوٹ: میں انجینئر ظفر محی الدین ہوراں دیاں ہجراں تے بوہتا نئیں لکھیا ------ کیوں جے ------ انجینئر صاحب مینوں جدوں وی ملے ------ ''ہولال نی میرا پیا گھر آیا'' تے ''شکر ونڈاں'' دی کیفیت چ ملے تے مِلدے ای رہسن ------ انشاءاللہ

حق، حق، حق ------ یاعلیؑ حیدر

مستیِ حسن لیے جب وہ نمایاں ہوں گے
بے سخن لوگ بھی اُس وقت غزل خواں ہوں گے
جی میں آتا ہے کہ آج اُن کو ستائیں ہم بھی
کچھ تو آشفتہ سری سے وہ ہراساں ہوں گے
حالِ دل اپنا کہیں اب تو چمن میں جا کر
رازداں ہوں گے سبھی گُل یا پریشاں ہوں گے
میری ہستی میں جو داخل وہ ہوا مستِ شباب
میرے اندازِ سخن کے نئے عنواں ہوں گے
تم کبھی ایک نظر، نظرِ کرم سے دیکھو
کام جتنے مرے مشکل ہیں وہ آساں ہوں گے
دھیان تیرا تو چمن زار بنا دے گا انھیں
میرے رستے میں اگر لاکھ بیاباں ہوں گے
التفات ہو نہ سکا اُن سے اگر وصل کی شب
کس کے گیسو میرے شانوں پہ پریشاں ہوں گے
اُن کو جی بھر کے تو کر لینے دے دل مشقِ ستم
وہ بھی آخر کبھی زیرِ غمِ دوراں ہوں گے
جو کشش بخشی نقابِ رُخِ زیبا نے انھیں
وہ نگہ دل کے لیے خوب نمایاں ہوں گے
رنگ اور خوشبو کا سیلاب لیے آتے ہیں
پھر مرے دل کے لیے حشر کے ساماں ہوں گے
رشکِ گُل چہرہ ترا مستی بھری آنکھیں تری
اُن کی رعنائی سے اس دل میں چراغاں ہوں گے
کہکشاں میری کا چاند آ گیا دل کے نزدیک
جس کے آنچل میں کئی انجم رخشاں ہوں گے
دل کسی طور نہ آئے گا کبھی ہاتھ مرے
سامنے میرے جو غارت گرِ ایماں ہوں گے
اُن پہ مسعودؔ نہ رکھ ایسی حریصانہ نظر
ایسا کرنے سے نہ پھر دید کے ساماں ہوں گے
خالد مسعود/ لاہور

صاحب...... حسن عباسی کی حمدیہ کاوش

محمد نوید مرزا/لاہور

حسن عباسی کے شعری سفر کے پیچھے ایک طویل ریاضت ہے۔ ایک غزل گو شاعر کے طور پر ادبی دنیا میں وارد ہونے والے حسن جب مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کرنے نکلے تو ربّ کائنات کے حضور ''سائیں'' جیسی خوبصورت کاوش پیش کی۔ حسن عباسی کے پہلے حمدیہ مجموعے کی منفرد اور اعلیٰ شاعری کی گونج ابھی سنائی دے رہی تھی کہ انہوں نے ''صاحب'' کے نام سے دوسرا حمدیہ مجموعہ پیش کر کے اپنے قارئین اور ہم عصر شعراء کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اللہ پاک کے لیے ''صاحب'' کا خطاب ایک خوبصورت اور منفرد بات ہے۔ واقعی وہی صاحب ہے اور وہی صاحب کمال ہے۔ وہ مادی ہے اور ہم ذرۂ خاک، ہم اس کے غلام ہیں۔ جو اُس صاحب کا ہو جاتا ہے اُسے دونوں جہان کے خزانے مل جاتے ہیں۔ حسن بھی اپنے خزانوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ بقول بشریٰ رحمٰن، عشق تو بس ایک ہی ہے۔ ''صاحب'' کا عشق۔ جسے نصیب ہو وہ صاحب دل بن جاتا ہے۔ صاحب حال اور صاحب حال ہو جاتا ہے۔ حسن عباسی ایک صاحب حال شاعر ہے۔ اس کی شاعری روح کے سفر کی شاعری ہے۔ اندر کی آنکھ کے بھید بھاؤ کی چشم دید گواہ ہے۔

حسن عباسی عشق حقیقی کی آگ میں تپ کر کندن بنے ہیں۔ ان کے اس حمدیہ مجموعے میں کہیں خدائے بزرگ و برتر کے حضور دھیما سا شکوہ ہے تو کہیں اس کائنات کی رنگا رنگی میں ہر طرف پھیلے ہوئے مالک دو جہاں کے حسن بے مثال کا خوبصورت انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

شکوہ کا انداز دیکھیں:

آپ کے ہوتے ہم جیسوں پر
لاکھوں کا قرضہ ہے صاحب

....

آپ کے در پر آیا تھا میں
اس پر بھی تالا ہے صاحب

اب ایک دوسرا انداز دیکھیں جہاں ''صاحب'' سے مخاطب ہو کر وہ خوبصورت انداز میں کہہ رہے ہیں:

میں نہیں ہوں، کہیں نہیں ہوں میں
آپ ہی آپ، آپ ہے صاحب

....

سب نے دیکھا مکان صاحب کا
میں نے دیکھا جہان صاحب کا

ایک اور انداز دیکھیں جس میں انسان کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا رہا ہے:

جو بس میں ہو تو نظر نہ آؤں
ہوں اس قدر شرمسار صاحب

....

حمد لکھ کر بھی کم نہیں ہوتی
مجھ میں کیسی بھڑاس ہے صاحب

حسن کی شاعری کے بارے میں نذیر قیصر یوں رقم طراز ہیں:

''حسن عباسی نے اپنے شعری سفر میں سائیں سے صاحب تک جس بادشاہ کی تلاش کی ہے وہ ان کے باطن میں پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا ہے۔ آدمی جیسا خود ہوتا ہے اُس کا خدا بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ حسن عباسی نے اپنے خدا کو اپنے خوابوں کے خدوخال میں تراشا ہے۔''

حسن عباسی نے اپنی حمدیہ شاعری میں اندھیرے سے روشنی تک کا سفر اپنے خوابوں کے خدوخال تراش کر ہی تو کیا ہے۔ ان کے کلام میں روانی اور بے ساختگی ہے جو ان کا ایک نمایاں وصف ہے۔ انہوں نے ''صاحب'' میں منجھے ہوئے تخلیق کار کی طرح اس کائنات کی موجودہ صورتِ حال اور توصیف کون و مکاں کو شعری مالا میں پرو کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ انہیں شعر کہنے میں مہارت ہے اور حمدیہ کلام میں ان کا یہ ہنر کھل کر قاری کے سامنے آیا ہے۔ چند شعر دیکھیں:

جن رنگوں میں دیکھی دنیا صاحب کی
اُن رنگوں میں کی ہے پوجا صاحب کی
میں تو اُس کو چھونے سے بھی ڈرتا ہوں
چیز ہوا کرتی ہے بڑھیا صاحب کی
اُس کا نشہ ہرگز ٹوٹ نہیں سکتا
جس نے گھول کے پی لی پڑیا صاحب کی

....

جیسے بچہ میلے میں ضد کرتا ہے
ایسے پکڑا ہوا ہے پلو صاحب کا

معروف شاعر ایوب خاور حسن عباسی کے بارے میں فرماتے ہیں:

پتہ چلا ''صاحب'' صرف کتاب کا عنوان ہی نہیں ساری کی ساری حمدوں کی ردیف بھی ہے۔ اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں واضح کر دیا ہے کہ میں نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے۔ صوفیا کرام نے تشریح کر دی ہے رب انسان کے اندر ہے۔''

مزید لکھتے ہیں: ''دوستوں میں تو اس حمدیہ مجموعے پر مرمٹا ہوں۔ کیونکہ ''صاحب'' میں خدا ایک ایسی جدت ہے جو کم از کم میں نے کسی مجموعے میں دیکھی نہ پڑھی۔''

اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرز کے حمدیہ مجموعے کم ہی شائع ہوئے ہیں۔ ویسے بھی اُردو زبان میں حمد نگاری کرنے والے شاعروں کی تعداد بہت کم ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ خالق کی توصیف کو لفظوں کی مالا میں پرونا ایک کارِ مشکل ہے۔ بقول لطیف ساحل ''حسن عباسی کے کلام میں ارتقائی عرفان کے مراحل طے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''صاحب'' حسن عباسی کے حمدیہ کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کا حمدیہ کلام ''سائیں'' احباب علم و دانش کو نظر نواز کیا جا چکا ہے۔ ''سائیں'' اللہ تعالیٰ کی ذاتِ با اقتدار کا استعارہ ہے اور ''صاحب'' اُس کے حسن و جمال کی تمثیل اور اُس کی رحمت بابرکت کا کنایہ۔ ''سائیں'' میں سائل اور آقا کے درمیاں جو فاصلہ اور دوری تھی، ''صاحب'' نے اس فاصلے اور دوری کو کم کیا ہے۔''

ساحل صاحب کی رائے کے تناظر میں اگر ''صاحب'' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ''سائیں'' اپنی جگہ ایک خوبصورت کاوش ہے۔ مگر صاحب فنی، تخلیقی اور معنوی اعتبار سے اُس سے آگے کی منزل ہے۔ آخر میں لبنیٰ صفدر کی اس رائے کے بعد اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں۔

''صاحب'' جدید تر اردو شاعری میں شاندار اضافہ ہے۔ متنوع مضامین، رنگا رنگ کی باتیں اور مسائل، تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال شاعر کی اپنے فن پر مطبوعہ گرفت کی نشاندہی کرتا ہے۔

میں حسن کو اس خوبصورت مجموعے کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

خالد مسعود/لاہور

ہمیں شکایت نہیں کہ کیوں ہیں اُداس رہرو اُداس راہیں
جو زندگی ہی میں تلخیاں ہوں کہاں سے لائیں مٹھاس راہیں
ہماری قسمت کہ منزلوں کا کہیں تعین نہیں ہوا ہے
کہ خضر کی پیروی میں آئیں گی اب نہ دل کو یہ راس راہیں
کوئی بتائے کہ منزلوں کی ہوئی نہ پہچان کس سبب سے
بڑے قیافہ شناس رہرو، بڑی قیافہ شناس راہیں
عجب اُمیدوں کا رنگ و نغمہ نصیب تھا اُنکی صحبتوں میں
بچھڑ کے رہ جائیں سارے ساتھی تو کیوں نہ ہوں محوِ یاس راہیں
ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں تیرے نظارے کی اک جھلک کو
کبھی تو آہٹ سُنیں گے تیری بُجھا ہی دیں گی یہ پیاس راہیں
ترے مسلسل سکوت پر بھی ہم اتنے نومید تو نہیں ہیں
عجب امیدیں لیے دلوں میں لگائے بیٹھی ہیں آس راہیں
نہ رنگ و خوشبو نہ صوت و نغمہ نہ دلنوازی ہے رہگزر میں
چلے گئے تم تو رہ گئی ہیں محبتوں کی اداس راہیں
ہماری محرومیوں کے قصے ہوئے ہیں رسوا جہاں میں کیونکر
ہمیں ہے کیوں انتظار اُن کا، نہ کر سکیں گی قیاس راہیں

فرزانہ فرحت/لندن

چہرہ وہ مری آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتا
یہ ایسا معمہ ہے کہ جو حل نہیں ہوتا

آنکھوں میں دھواں سا ہے یہ آنسو تو نہیں ہیں
صحراؤں کی مٹی میں تو جل تھل نہیں ہوتا

دیوانے کو پتھر سے نہ مارو مرے لوگو
دیوانہ تو دیوانہ ہے پاگل نہیں ہوتا

رہتا ہے ہمیشہ مرا ہر خواب ادھورا
افسانہ محبت کا مکمل نہیں ہوتا

بن بن کے بگڑ جاتے ہیں ہر رات مرے خواب
کیوں خواب مرا کوئی مسلسل نہیں ہوتا

فرحتؔ کو سماں خواب میں ملتا نہیں پیارا
سر پر جو ترے پیار کا بادل نہیں ہوتا

....

مصرع طرح
''شبنم کو ریت پھول کو کانٹا بنا دیا''

سسّی بنا دیا کبھی لیلیٰ بنا دیا
مجھ کو کسی کے پیار نے کیا کیا بنا دیا

یہ عشق تو دلوں کی عبادت ہے دیکھیے
دنیا نے جس کو کھیل تماشہ بنا دیا

انسان اس طرح سے ہوا نفس کا غلام
ان خواہشوں نے اس کو درندہ بنا دیا

نفرت کی آندھیوں نے چمن کو اُجاڑ کر
شبنم کو ریت پھول کو کانٹا بنا دیا

فرحت خیال و خواب میں الجھی ہوں اس طرح
میں نے حقیقتوں کو بھی سپنا بنا دیا

خوف

عطاءالحق قاسمی/لاہور

''ملک صاحب! اس وقت آپ کی عمر کتنی ہے ؟'' میں نے اپنے پڑھے لکھے بزرگ دوست ملک خورشید احمد سے پوچھا!

''ایک سو دس برس'' ملک صاحب نے کہا

''آج آپ اپنی طوالت عمر کا راز بتا ہی دیں!''

''اب یہ راز بتانے کا کیا فائدہ کیونکہ اب تو گنتی کے چند سانس رہ گئے ہیں۔ آج نہیں تو کل اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا۔''

''چھوڑیں ملک صاحب' یہ ''لارا'' تو آپ ہمیں کب سے دے رہے ہیں آپ یہ بتائیں کہ اتنی طویل عمر کا راز کیا ہے؟''

''تو گویا میں مذاق کر رہا ہوں''

''تو پھر سن لو...... میری طوالت عمر کا راز شدید خوف کے عالم میں زندگی بسر کرنے میں ہے'' ملک صاحب نے خوف سے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب وہی جو تم سمجھے ہو۔ جب میں پیدا ہوا تو میرا وزن ساڑھے چار پاؤنڈ تھا' ڈاکٹروں نے کہا اس کا زندہ بچنا مشکل ہے۔ مگر میں نہ صرف یہ کہ بچ نکلا بلکہ مہینوں ہی میں خاصا صحت مند بھی ہو گیا''

''یہ تو آپ کے ہوش سے پہلے کا واقعہ ہے۔''

ہاں مگر ذہن پر اس کا اثر تو رہتا ہے۔ جب ذرا بڑا ہوا تو والدہ نے گھریلو حالات سے تنگ آ کر مٹی کے تیل کی بوتل پی لی' جس سے ان کا کلیجہ چھلنی ہو گیا اور وہ میرے سامنے سسک سسک کر مر گئیں۔''

''پھر؟''

''پھر اس کے بعد تو ذہن پر خوف اس قدر سوار ہوا کہ آج تک اسی خوف کے سہارے زندہ ہوں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''میں تمہیں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا۔ میں تو تمہاری فرمائش پر کچھ حقائق بیان کر رہا ہوں یہ باہر کھڑاک کیسا ہوا ہے؟''

''آپ تو ایسے ہی ڈر جاتے ہیں کوئی بلی ولی ہوگی''

''کوئی کلاشنکوف والی بلی نہ ہو۔ ذرا ہمت کرو' اٹھ کر دیکھ ہی لو'' ملک صاحب نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

باہر کوئی بھی نہیں تھا' چنانچہ میں دوبارہ ملک صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''عین عالم شباب میں ایک اور خوف دامن گیر ہوا'' ملک صاحب نے بتایا'' عالم شباب کا یہ خوف عالم شباب ہی کے حوالے سے تھا۔ حکیموں اور سنیاسی بابوں کے اشتہاروں نے میری راتوں کی نیند اڑا دی۔''

''پھر کیا ہوا'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''پھر کیا ہونا تھا' بچے ہوئے' ان کی شادیاں ہوئیں''

''پھر؟''

''پھر ان بچوں کے بارے میں تفکرات شروع ہو گئے اب ان تفکرات کے سہارے زندہ ہوں' اللہ کے فضل سے کوئی نہ کوئی مسئلہ سامنے آتا ہی رہتا ہے۔''

''مگر ان تفکرات اور خوف کا طوالت عمر سے کیا تعلق ہے؟''

''اس مسئلے پر بھی بات ہوگی۔ پہلے میں تمہیں یہ تو بتا لوں کہ اشیائے خورونوش میں ملاوٹ' زندگی بچانے والی جعلی ادویات' دن دہاڑے ڈکیتی کی وارداتیں' بچوں کے خرکار کیمپ' ہتھوڑا گروپ کی وارداتیں اور اس طرح کے دوسرے بے شمار خوف مجھے زندہ اور صحت مند رکھے ہوئے ہیں!''

''یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں''

''میں صحیح کہہ رہا ہوں' مختلف بیماریوں کی اخبارات اور ٹیلی ویژن کلینک میں تشہیر بھی اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو رہی ہے۔''

''وہ کیسے''

''وہ اس طرح کہ اخبارات میں شائع ہونے والے ڈاکٹروں کے کالموں اور ٹیلی ویژن کے طبی پروگراموں میں بیماری کی جو علامات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر مجھ میں پائی جاتی ہیں۔ اور یوں میں 24 گھنٹے شدید خوف میں مبتلا رہتا ہوں مثلاً کینسر کی ایک علامت یہ ہے کہ منہ میں لعاب زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دنوں میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ لعاب دہن زیادہ پیدا ہو رہا ہے اس طرح ذیابیطس میں پیشاب زیادہ آتا ہے۔ مجھے بھی دن میں کئی دفعہ

باتھ روم جانا پڑتا ہے۔ دل کی تکلیف میں بازو درد کرتا ہے۔ میرا بازو بھی اکثر درد کرتا رہتا ہے۔ اخبارات میں ایڈز کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ انسان کی قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے چنانچہ نزلہ زکام کھانسی وغیرہ بھی لاحق ہو جائیں تو ٹھیک ہونے میں نہیں آتیں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ کئی مہینوں سے میری کھانسی ٹھیک نہیں ہو رہی۔ بلڈ پریشر میں چکر بہت آتے ہیں اور میرا یہ حال ہے کہ ان چکروں کی وجہ سے کئی دفعہ اپنی جگہ پر کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ چنانچہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ میں بلڈ پریشر' ہارٹ ٹربل' ذیابیطس' کینسر اور ایڈز جیسے مہلک امراض کے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں' اس خوف نے میری راتوں کی نیندیں حرام کی ہوئی ہیں۔''

ایڈز کے لفظ پر میں نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

''ایک خوف ان کے علاوہ بھی ہے'' ملک صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''وہ نت نئے ایٹمی ہتھیاروں اور عالمی جنگ کے حوالے سے ہے۔ اس کے علاوہ اتنی کائنات میں انسان کی حیثیت کے بارے میں جو سائنسی انکشافات ہوئے ہیں' وہ بہت خوفزدہ کرنے والے ہیں'' اس کائنات میں ہمارے کرۂ ارض کی کوئی حیثیت نہیں انسان کی کیا حیثیت ہے اور اگر بنی نوع انسان کی کوئی حیثیت نہیں تو پھر میری ذاتی حیثیت تو زمین پر رینگنے والے ایک کیڑے سے بھی کم ہے۔ کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر حیثیت میں زندہ رہنے کا احساس بہت جان لیوا ہے۔''

مجھے اب ملک صاحب کی باتوں سے وحشت سی آنے لگی تھی چنانچہ میں نے سلسلہ کلام مختصر کرتے ہوئے کہا ''خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ ذاتی طوالت عمر اور عمدہ صحت کا راز بتائیں؟''

''تو اتنی دیر سے اور میں کیا بتا رہا ہوں'' ملک صاحب نے ناراضگی سے کہا ''میں تمہیں یہی بتا رہا ہوں کہ یہ سارے خوف مجھے زندہ اور توانا رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ان دنوں پاکستان کے بارے میں غفار خان' جی ایم سید' ولی خان اور ممتاز بھٹو وغیرہ جس طرح کے بیانات دے رہے ہیں اور ان لوگوں کے جلسوں میں پاکستان توڑنے کے جو نعرے لگ رہے ہیں' یہ سب صورت حال میرے خوف میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ بلکہ ان لوگوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے محب وطن قوتیں جس طرح ایک دوسرے کے لیے تیغ بے نیام بنی ہوئی ہیں' فرقہ پرست مولوی جس طرح دشمنوں کے ساتھ مل کر پاکستان سے محبت کرنے والوں کے خلاف محاذ آرا ہیں اور ایسے معاملات میں سچ کا ساتھ دینے کی بجائے میں اور تم جس طرح مصلحتاً خاموش ہیں' یہ سب چیزیں مجھے اندر سے شدید بے چین رکھتی ہیں چنانچہ میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں اپنے ملک کے بارے میں اور بنی نوع انسان کے مستقبل کے بارے میں سخت متفکر ہوں لیکن میرے عزیز یہی خوف مجھے میرے ملک کو اور بنی نوع انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''مگر وہ کیسے؟'' میں نے اس دفعہ چڑ کر سخت جھنجھلاہٹ کے عالم میں کہا۔

''وہ ایسے کہ خوف کمزور سے کمزور اور بزدل سے بزدل انسان کو بھی خطرات کے مقابلے کے لیے تیار کرتا ہے۔'' ملک صاحب نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا ''یا کم از کم اس میں تیار کرنے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے جسے استعمال میں لا کر بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔''

''اور اپنے کان ادھر لاؤ' ملک صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کپکپاتی آواز میں کہا'' میں تمہیں آخر میں ایک راز کی بات بتاتا ہوں ...... یہ جو بلی ہے نا ...... یہ سنسان اور ویران جنگلوں میں بالکل اکیلی رہا کرتی تھی ایک روز یہ جنگل کی ویرانیوں اور ہولناک سناٹوں سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ مارے خوف کے شیر بن گئی۔''

میں ملک صاحب کی بات سے متاثر ہوا مگر میں نے پوچھا اور یہ جو بلیاں شہروں میں چوہوں کا شکار کرتی اور انسانوں کے پاؤں چاٹتی نظر آتی ہیں' یہ کون ہیں؟''

''یہ وہ بلیاں ہیں جو جنگل کی ہولناک سفاکیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے شہروں میں آ گئیں اور یوں پر خطرات زندگی کے ثمر سے محروم ہو گئیں چنانچہ شیر بننے کی بجائے یہ شہروں میں چوہوں کا شکار کرتی ہیں اور انسان کے پاؤں چاٹتی ہیں۔ میرے عزیز! یہ بھگوڑی بلیاں ہیں جو مارے خوف کے شیر بن سکتی تھیں مگر پرسکون زندگی کی خواہش نے انہیں پاؤں چاٹنے والی مخلوق بنا دیا!۔''

بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
لاہور
بک ڈائجسٹ
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
بک ڈائجسٹ

ابدالین

احمد سعید/فیصل آباد

میں بیک وقت ابدالین، راوین، پنجابین اور نیشنل کالج آف آرٹس کو پتہ نہیں کیا کہتے ہیں؟ خیر جو بھی کہتے ہیں وہ بھی تھا۔ ان اداروں میں باقاعدہ ایڈمیشن تو نہیں لیا تھا (ملتا تو لیتا) پھر بھی ان کا حصہ ضرور تھا۔ اپنی اسناد سے تو میں یہ بات ثابت نہیں کر سکتا، البتہ اپنے دلائل سے میں آپ کو قائل کرنے کی پوری کوشش کرسکتا ہوں۔ خود اپنے آپ کو بھی میں نے انہیں دلائل سے ہی قائل کیا ہے۔ سب سے زیادہ میرا وقت کیڈٹ کالج حسن ابدال میں گزرا اور بہت خوبصورت گزرا، پر بہت جلد گزر گیا۔

وہاں ایڈمیشن آٹھویں جماعت میں ملتا ہے، پر میں پہلی دوسری جماعت سے بھی پہلے ہی وہاں ایڈمیشن لے چکا تھا۔ اصل میں ماموں جان کیڈٹ کالج حسن ابدال میں پڑھاتے تھے، اور ہم گرمیوں کی چھٹیاں وہیں مناتے تھے۔ صبح لائبریری میں، دوپہر کو سوئمنگ پول، شام ڈھلنے سے پہلے کالج کے پیچھے ندی اور ندی کے پار پہاڑ پر، شام کو بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس اور رات کو Cycling۔ یہ ساری ’’غیر نصابی آوارہ گردیاں‘‘ وہاں کے حقیقی طلباء کو بھی میسر نہیں تھیں۔ ہم جب بھی ماموں کی طرف جاتے تو میرے کزن کی آنکھوں میں خوشی اور غمی (غصے) کے ملے جلے آثار پائے جاتے۔ غصہ اسے اس بات کا ہوتا کہ یہ آ گیا ہے اور اب اس نے تین ماہ تک میرا سائیکل اپنے قبضے میں کر لینا ہے۔ اس نے ماموں مامی کو اکثر کہنا کہ احمد بھائی مجھے سائیکل ہی نہیں دیتے۔ انہوں نے کہنا انس بیٹا وہ صرف دو ماہ کے لیے تو آتا ہے کونسا روز روز آتا ہے۔ اسنے کہنا ہمیں پورا سال اتنا سائیکل چلانے کو نہیں ملتا جتنا یہ روز روز نہ آ کر چلا لیتا ہے۔

میرے لیے کالج کے ساتھ ہی جو ندی تھی اور اس کے پار جو پہاڑ تھے وہ افسانوی سی حیثیت رکھتے تھے۔ جب بھی میں وہاں سے ہو کر آتا تو ایسے محسوس ہوتا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ اگلے دن پھر وہ خواب دیکھنے ندی پہ چلا جاتا۔ میرے دوسرے کزن انیق نے ایک دو مرتبہ ماموں کو بتایا کہ ابو یہ اکیلا ندی پہ جاتا ہے اور ندی پار بھی کرتا ہے۔ ماموں اس طرح کے معاملات میں بڑے سخت تھے لیکن انہوں نے مجھے اکیلے ندی اور اس کے پار جانے سے کبھی کچھ نہ کہا۔ شاید انہوں نے میری آنکھوں میں وہ خوبصورت ندی اور دلکش پہاڑ دیکھ لیے تھے، یا وہ یہ جان گئے تھے کہ ’’ڈنڈا پیراے وگریاں تگڑیاں دا‘‘ یعنی لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ خیر نہ انہوں نے مجھے باتوں سے منع کیا اور نہ ہی لاتوں سے۔ میں اُن پہاڑوں پر کبھی نہیں چڑھا تھا، اونچے ہی بہت تھے چڑھتا کیا؟ ایک دفعہ حوصلہ پکڑا، پکڑا تو نہیں جا رہا تھا، لیکن پھر بھی آنکھیں بند کر کے پہاڑ پر چڑھنے کی ٹھان لی اور چڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ پہاڑ کی چوٹی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ دل کیا کہ مڑ کر نیچے دیکھوں۔ پر میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا کہ تم سے تو اوپر نہیں دیکھ ہو رہا نیچے کیا دیکھو گے؟ پر اب دل نے کہہ جو دیا تھا، تو دیکھ لیا پیچھے مڑ کر، میری آنکھیں چندھیا گئیں اور مجھے ایسے لگا کہ میں پتھر کا ہو گیا ہوں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میں یہ ’’کے ٹو‘‘ سر کئے بیٹھا ہوں۔ ہوش آیا تو سوچا اترنا کیسے ہے؟ یہ سن رکھا تھا کہ پہاڑ چڑھتے ہوئے نیچے نہیں دیکھنا چاہیے، پھر بندہ آسانی سے پہاڑ چڑھ جاتا ہے۔ اب پہاڑ سے نیچے اترنے کے لئے کچھ نہیں سن رکھا تھا۔ دل نے کہا، پھر یہ ہی ہوگا کہ نیچے اُترتے ہوئے اوپر نہیں دیکھنا چاہیے۔ میں دل کی اس قسم کی نصیحت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس پہاڑ سے میں جیسے اترا وہ پہاڑ ہی جانتا ہے۔

’’ایف اے‘‘ کے بعد میں اپنے آپ کو ’’راوین‘‘ کہلوانے لگ پڑا۔ ابھی داخلہ تو نہیں لیا تھا، پر Prospectus جو لئے بیٹھا تھا وہاں کی۔ شکر کریں آپ (اصلی راوین) کہ کہیں میں نے اپنے آپ کو وہاں کا پروفیسر نہیں کہنا شروع کر دیا۔ ایک دن میں پنجاب یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) میں بھی گھس گیا ’’پراسپیکٹس‘‘ لینے۔ آفس ڈھونڈتے ڈھونڈتے کچھ لڑکیاں ڈھونڈ لیں۔ ان سے پوچھا کہ مجھے فلاں آفس میں جانا ہے۔ اُن میں سے ایک کہنے لگی کہ آفس دور ہے۔ پھر چند سیکنڈوں کے لیے اس نے کچھ سوچا اور مجھے کہا کہ میں آپ کو وہاں لے جاؤں؟ دل نے کہا کہ آپ کہیں تو میں ٹیکسی کرا لیتا ہوں، خیر وہ مجھے وہاں تک چھوڑنے آئی۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپکے نمبر کتنے ہیں؟ یہ سوال سن کر میرا ’’ترڈ‘‘ ہی نکل گیا۔ میں نے کہا میرا خیال ہے کہ B یا C گریڈ ہوگا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے بات کو اتنی تیزی سے موڑا جیسے بیگم آپ سے منہ موڑتی ہے۔ کہنے لگا کہ آپ کا ادارہ ایک تاریخی ادارا ہے۔ وہ کہنے لگی یہ بات کس کو نہیں معلوم؟ اس نے یقیناً یہ جواب B اور C گریڈ والی حرکت پہ دیا ہوگا۔ ورنہ جو اتنی دور چھوڑنے آئی اُسنے ایسے سیدھا ہی جواب تھوڑی دینا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا ایسے ہی فرانس جانے کا سوچتا رہتا ہوں، بس لاہور لاہور اے۔ فارم وہیں فِل کر کے اسی وقت جمع کرائے اور سیدھا فیصل آباد آ گیا۔ انتظار کرتا رہا اور کرتا ہی رہا، پر چٹھی نہ کوئی سندیس۔ اس سے پہلے کے فیصل آباد میں بھی کہیں ایڈمیشن نہ ملتا، ’’اوکھے سوکھے‘‘ ہو کر یہیں داخلہ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

’’پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا‘‘

سمندر، سراب میں

حنیف سیّد

دیپو، جوان تھا اور مریضِ عشق بھی۔ ایسے عاشقوں کے قول و فعل کا اعتبار ہی کیا...؟ خود بھی اُس کا کہنا تھا: ''بھئی، میں نے وعدہ کرنا چھوڑ دیا ہے اب، کیوں کہ میں وعدہ نباہ نہیں پاتا، لوگ مجھ سے کہہ کر چلے جاتے ہیں؛ دیکھا تیرا وعدہ۔'' اُس کی اِس بات پر غصہ تو بہت آیا، کہ لاؤ کہہ دوں: ''میرا کام واپس کردو...!'' لیکن کہا اِس لیے نہیں، کہ اگر کہہ دیتا، تو بس کہہ دیتا۔ حالاں کہ نقصان ہوتا، کیوں کہ میں چھیالیس سو روپے اُس کو پیشگی دے چکا تھا اور وہ اتنا پانی دار تھا نہیں، کہ میری رقم واپس کر دیتا۔

اُس کا بھائی راجو بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پہلے پہل میرے تعلقات اُسی سے ہوئے تھے۔ مجھ کو بہت پسند تھا راجو۔ ایک بار میں نے اپنے ایک جگری دوست آفاق کے ساتھ مشترکہ طور پر اسکول کے سرٹی فیکٹ چھپوائے تھے راجو سے۔ جب حساب بنا کر اُس نے دیا، تو میں نے کہا: ''سارا حساب میں چکائے دیتا ہوں، مگر تم آفاق سے بھی حساب کے لیے کہنا، اگر وہ رقم دے دیں تو آدھی رقم مجھے واپس کر دینا، ورنہ کوئی بات نہیں۔''

کئی ماہ بعد راجو نے بتایا: ''آفاق نے کچھ نہ دیا۔'' بات ختم ہوگئی۔ اُس کے بعد میں نے آگرہ کے اپنے ایک عزیز کا سہرا شادی سے کافی دِن پیشتر راجو کو چھپنے کے لیے دیا۔ وقت پر چھپ جانے کی غرض سے، میں ہر روز اُس کے یہاں چکر لگاتا رہا اور وہ مجھ کو نظرانداز کر کے دوسروں کا کام کرتا رہا۔ دِن گزرتے گئے اور جب وقت پر کام ہو جانے کی اُمید نہ رہی، تو میں نے ماتھے پر بل ڈال کر کام پورا کرنے کے لیے اُس سے کہا، جس پر اُس نے نظریں بگاڑ کر اتنی جلد کام دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے کام واپس مانگ لیا اور اُس نے میری اَڑد یکھ کر من مانی رقم لے کر اَدھورا کام واپس کر دیا۔ تیسرے روز مجھ کو آگرہ میں سہرا پڑھنا تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ حالاں کہ بعد میں راجو کو اِس کا احساس ہوا، اور اُس نے دیپو کو میرے پاس کام کے لیے بھیجا، پھر وہ خود بھی آیا معافی کے لیے، لیکن میں ہڑ کی لکڑی رہا۔

مجھ کو راجو کی بات پر شک ہوا، تو میں نے آفاق سے دریافت کیا: پتا چلا جناب اُن سے بھی سرٹی فیکٹ چھپوائی کی رقم اینٹھ چکے ہیں۔

دیپو، با اخلاق تھا، جب بھی ملتا پہلے سلام کرتا۔ حالاں کہ کمپیوٹر لائن میں راجو کو وہی لایا تھا۔ لیکن راجو نے جب اُس کو کمپیوٹر ٹیبل سے اُتار دیا، تو وہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر نوکری تلاش کرنے لگا۔ کمپیوٹر لگانے کے لیے میرے پیچھے بھی پڑا رہا وہ، مجھ کو ہم دردی بھی تھی اُس سے۔ دِل چاہتا تھا، کہ کمپیوٹر لگوا دوں، لیکن پھر وہی بات، کہ عاشق مزاج تھا وہ۔ کس وقت بدل جائے، کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔

ایک روز اُس نے مجھ سے کہا: ''کمپیوٹر لگا رہا ہوں، زیادہ نہیں صرف پانچ ہزار کی مدد لوں گا آپ سے۔'' میں نے ہامی بھرلی، اُس نے کمپیوٹر لگا لیا، مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ صبح شام میرے یہاں آتا، کام نہ ملنے کا افسوس کرتا۔ میں نے اپنا افسانوی مجموعہ دوسرے کو کمپوزنگ کے لیے دے رکھا تھا۔ آٹھ افسانے کمپوز بھی ہو چکے تھے۔ لیکن میں نے دوسرے کا حساب کر کے کام دیپو کو دے دیا۔ جب کام دیکھنے دیپو کے ہاں گیا تو بہت خاطر تواضع کی اُس نے۔ حلوا، چائے، طرح طرح کے بسکٹ، نمکین، اور نہ جانے کیا کیا...؟ اس کے ساتھ ہی کمپوز شدہ مجموعہ پروف ریڈنگ کے لیے میرے حوالے کر دیا، اور آگے کام کے لیے میرے گھر کے چکّر لگانے لگا۔ میں نے خوش ہو کر ناول بھی اُس کے سپرد کر دیا۔ اُس نے اُس کو بھی دو تین روز میں پورا کرنے کا وعدہ کیا۔

میں نے اپنے افسانوی مجموعے میں، محترم رشید حسن خاں کی کتاب ''املا'' کے مطابق املا لکھا تھا۔ اُس نے اُس املا کا خیال نہ رکھا، جس کی وجہ سے پروف ریڈنگ میں مجھ کو کافی وقت لگا، اسی درمیان اُس نے اشد ضرورت کے تحت میرے کیے وعدے کے مطابق پانچ ہزار روپے کا مطالبہ کیا، اور میں بڑی کوشش کے باوجود صرف چھیالیس سو روپے ہی دے سکا اُس کو۔ اُس کے ساتھ ہی ڈسٹرکٹ ریلی کے سرٹی فیکٹ بھی چھپنے کے لیے دے دِیے، مگر اُس کام کے لیے کئی چکّر لگانے

پڑے۔ حالاں کہ اُس نے اِس کا اعتراف کیا، ''اگر بار بار چکّر نہ لگاتے تو شاید یہ کام وقت پر نہ ہو پاتا، کیوں کہ مجھ کو اور بھی بہت سے کام تھے۔''

چوں کہ یہ کام اشد ضروری تھا، لہٰذا وقت پر دے دیا اُس نے اور ایسے وقت پر دیا، کہ اگر پانچ منٹ اور لیٹ دیتا تو بچوں کے انعامات تو بٹ جاتے، لیکن بچّے سرٹی فکیٹ سے محروم رہتے۔

اپنے افسانوی مجموعے کی پروف ریڈنگ لے کر جب اس کے پاس پہنچا، تو اُس نے بتایا، کہ وائرس آجانے کے سبب سارا کام واش ہوگیا۔ جس کا مجھ کو بہت افسوس ہوا، پھر میں نے عہد کیا کہ خود بیٹھ کر کمپوز کراؤں گا، جس سے املا میں غلطیوں کے امکانات کم ہوں گے؛ اُس نے بھی اِس عمل کو مناسب سمجھا۔

میں، پلان کے تحت میں جب اُس کے پاس جاتا، تو وہ دوسروں کے کاموں میں منہمک ملتا۔ میرے پاس وقت کی بہت قلت تھی۔ میں نے اُس کو کئی بار سمجھایا: ''میری تینوں بچیاں بیمار ہیں، جن کو وقت پر دوا میں ہی کھلاتا ہوں۔ میرے یہاں آٹھ بجے گیٹ میں تالا لگ جاتا ہے۔ میں بیمار بھی ہوں۔'' وغیرہ وغیرہ۔

میں اُس کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق پہنچتا، تو کہتا وہ: ''ارے بیٹھو تو۔'' میں گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھا رہتا اور وہ یکے بعد دیگرے کاموں میں لگا رہتا۔ فرصت پاتا تو اپنی محبوبہ کو خط لکھنے لگتا اور اگر میں اپنی اَڑ لیے بیٹھا رہتا، کہ آج میں اپنا کام لے کر ہی جاؤں گا، تو وہ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے چلا جاتا اور میں جل بھن کر اُٹھ آتا۔ میں اکثر سوچتا: ''اِس شخص میں رقم لینے کے بعد کتنا فرق آگیا ہے۔ پہلے صبح و شام گھر کے چکّر لگاتا تھا۔ بار بار فون کرتا تھا۔ میں اُس کے یہاں جاتا، تو بڑی خاطر تواضع کرتا تھا۔ اَب چائے کو بھی نہیں پوچھتا اور نہ اُس کو میری پریشانیوں کا احساس ہوتا ہے۔ جب جاؤ تو بس یہی، ''ارے بیٹھو تو۔'' اُس سے مجھ کو اِس قدر الرجی ہوگئی، کہ دِل چاہتا کہ کہہ دوں: ''کام واپس کر دو۔'' لیکن پھر وہی بات، کہ اگر کہہ دیا، تو پھر کہہ دیا۔

''اسکول کے سرٹی فیکٹوں کا وہ حساب نہیں ہو پایا کیا...؟'' ایک روز کمپیوٹر میں کچھ کمپوز کرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''ہاں....! ہوگیا، پر وہ رقم میں نے خرچ کرلی۔'' میں نے جل بھُن کر جواب دیا۔

''ارے بھئی، مجھے بہت ضرورت ہے۔'' اُس نے برجستہ کہا۔

''کیا کرتے ہو اتنی رقم...؟''

''پانچ سو کرایہ دیتا ہوں اِس کمرے کا، پندرہ سو کمپیوٹر کی قسط، تین ہزار ماں کو، سات ہزار کی آر۔ ڈی۔ چل رہی ہے محبوبہ کے نام۔ بیسی بھی اُسی کے نام پانچ ہزار روپے ہر ماہ کی، پانچ پان اور آدھا کلو مٹھائی بھیجتا ہوں ہر روز اُس کے لیے چاچا سوئٹ ہاؤس کی، پچیس ہزار کا سِٹ خریدا ہے سونے کا اُس کے لیے، دو ہزار نقد بھیجتا ہوں اُس کی جیب خرچ کے لیے ہر ماہ اور پندرہ سو بائک کے لیے جمع کرتا ہوں، جہیز کے لیے۔

''جہیز کے لیے...! کس کے جہیز کے لیے...؟''

''اپنے، اور کس کے...؟ اُدھر سے لوں گا جہیز میں، اُن لوگوں کی اتنی بساط کہاں، کہ وہ دیں۔ بائک نہ ملے گی تو میری بدنامی ہوگی، کہ سسرال سے بائک تک نہ ملی۔''

یہ سُن کر میں سوچنے لگا، کہ کتنا خود غرض ہے یہ شخص۔ آخر اِس کو میری رقم کا بھی تو سوچنا چاہیے۔ حساس لوگ قرض نبٹانے کے لیے اپنی بیسیاں، آر ڈیاں توڑ دیتے ہیں، اپنے مکانات، جایداد فروخت کر دیتے ہیں، اپنا قرض نبٹاتے ہیں اور ایک یہ صاحب ہیں، کہ قرض لے کر بیسیاں چلا رہے ہیں، اپنی محبوبہ کو مٹھائیاں بھیج رہے ہیں اور اپنی عزت بنانے کے لیے سسرال کی طرف سے جہیز جتا رہے ہیں۔ رقم واپس نہ کرے تو نہ سہی؛ میرا کام تو کرے۔ میرے بار بار ٹھنڈ میں دوڑنے کا احساس تو کرے۔ یہ بھی احساس نہیں کہ یہ بوڑھا، دیوار پھاند کر گھر جاتا ہے۔ نہ جانے کتنی بار کام کے لیے خود بلایا اُس نے اور جب پہنچا تو بس وہی: ''ارے بیٹھیے تو...!''

''ارے بیٹھیے تو...! ارے بیٹھیے تو...!'' سنتے سنتے سات ماہ بیت گئے۔ پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، کئی بار غصہ آیا، کئی ہفتے نہ گیا اور جب گیا تو بس وہی: ''ارے بیٹھیے تو...!''

''ارے بیٹھیے تو...! ارے بیٹھیے تو...!، سنتے سنتے تھک گیا، حد بھی ہوتی ہے کسی کام کی، اب میں نہیں آؤں گا، آپ وعدہ کریں کہ کب تک پورا کر دیں گے کام...؟'' میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''بھئی میں نے وعدہ کرنا چھوڑ دیا ہے اب، کیوں کہ میں وعدہ نباہ نہیں پاتا، لوگ مجھ سے

ملک مصیب الرحمٰن دوحہ کی ادبی دنیا کے سپہ سالار ہیں انکی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں

سید فہیم ہاشمی کے ساتھ ایک مکالمہ......شہزاد بیگ

گذشتہ دنوں دوحہ میں مقیم نئی نسل کے خوبصورت شاعر سید فہیم ہاشمی پاکستان تشریف لائے جہاں انکے ساتھ کئی نشستیں ہوئیں اور وہ چار روز اسلام آباد میں این بی ایف کے قومی کتاب بطور سفیر کتاب میلے میں بڑے انہماک کیساتھ نظر آئے۔

دوحہ قطر دنیا کا گرم ترین خطہ جو کبھی بھی اردو ادب کا مرکز نہیں رہا پھر یہ دبستان دہلی لکھنو اور لاہور کے ہوتے ہوئے اردو ادب کا گہوارہ کیسے بن گیا، نوبل انعام کے بعد اردو ادب کا سب سے بڑا ایوارڈ یہاں سے کیسے جاری ہو گیا؟

بیگ صاحب بہت خوب جہاں اردو ادب کی کھیتیاں آباد کرنے والے ملک مصیب الرحمٰن جیسے لیجینڈ موجود ہوں جن کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہو وہاں یہ ناممکن کام بھی ممکن ہو جاتا ہیں یہ سب ملک مصیب الرحمٰن کی محبتوں کی داستان ہے ان کے اندر ایک بہت بڑا شاعر موجود تھا جو وقتاً فوقتاً ہم سے پاکستانی ادب پر محبت کا اظہار کرتے رہتے تھے مگر 1991ء میں جب ملک مصیب الرحمٰن نے پاکستانی شاعروں کو زیادہ پرموٹ کرنے کا سوچا تو عالمی مجلس اردو ادب دوحہ ایوارڈ اور عالمی مشاعرہ کا اجراء کیا اور کمال محبت سے اس میں انڈین شاعروں ادیبوں کو بھی شامل کیا اور پاکستانیوں کو بھی، اس کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی آبیاری کا کام بھی پوری تن دہی کے ساتھ جاری رکھا یعنی یہ سب اعزاز ملک مصیب الرحمٰن صاحب کی ذات کو جاتا ہے۔

اپ نے تقریباً دو دہائی ملک صاحب کے ساتھ مجلس اردو ادب میں گذاریں ان کی وفات کے بعد پھر یہ اچانک آپ نے پاکستان ایسوسی ایشن کا قیام کیوں عمل میں لایا وہ تو آپ کی پہلی محبت تھی؟

دراصل میں اپنے دوستوں سے محبت کرتا تھا بس یہ سارا عمل اسی محبت کا شاخسانہ تھا میں ان شاءاللہ جس قدر ہو سکا اپنے ساتھیوں سے مل کر اردو ادب کی خدمت کروں گا اور جینوئن اہل قلم کے لئے کام کو ترجیح دونگا۔

کیا اب آپ تعلقاتی مشاعروں سے چھٹکارا پا سکیں گے؟

میرا بطور چیرمین ایک مشن ہے جسے میں ہر صورت پورا کروں گا اور بساط بھر شاعروں کو مدعو نہیں کروں گا اب صرف نئے تازہ کار اور غیر وابستہ شاعر ادبی گروہ بندی سے پاک ہی دوحہ کی ادبی بستی میں متعارف کروائے جائیں گے جس کی واضح مثال ہمار پہلا ایوارڈ ہی ہے جو پاکستان کے شاعر فرحت عباس شاہ کو دیا ہے میں تعلقات، روابط، اختیارات، گروپ بندی اور گھسے پٹے شاعروں اور، متشاعروں کی صف کو دوحہ سے بالکل صاف کر دینا چاہتا ہوں جو سلسلہ عرصہ دراز سے چل رہا ہے اسے بند کر دیا ہے میں آپ کے ان خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں اور آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ ایک اچھا کام کرنے جا رہا ہوں۔

آپ کے ہاں کس قسم کے شاعر زیادہ مقبول ہیں؟

ہمارے ہاں آج بھی اردو غزل مشاعرے کی مقبول ترین صنف سخن ہے جسے دوحہ مشاعروں نے بہت پروف کیا ہے اگرچہ ان مشاعروں میں پاکستانی اور انڈین شعراء ففٹی ففٹی ہوتے ہیں جس میں ترنم اور گروپ بازی بھی ہوتی ہے آج کا شاعر اپنے آپ کو بطور گلوکار بھی پیش کرنا چاہتا ہے اور فنکار بھی جبکہ یہ صورتحال پاکستان میں قدرے مختلف ہے

دوحہ مشاعروں میں پاکستان سے مسلسل پسند اور ناپسند کا سلسلہ جاری ہے اس پر کیا کہیں گے؟

میں آپ کی اس بات پر سو فیصد متفق ہوں ہر کسی کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں پسند ہوتی ہے گروپ بندیاں بھی ہیں اس کے باوجود پاکستان عمدہ شعراء بلانے کی پوری کوشش کرتا ہوں یہاں پر پیرزادہ قاسم، انور شعور، سلیم

کوثر، عباس تابش اور فرحت عباس شاہ کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔

بہت قریب سے کوئی ندا سنائی دی خدا کو میں نے بہت دور سے پکارا تھا

مزاحیہ مشاعروں کی دوحہ میں کیا صورتحال ہے کیا یہ سنجیدہ مشاعروں کو کھا گئے ہیں؟

مزاحیہ مشاعروں کا ادھر بھی بہت زور ہے انڈیا اور پاکستان کے تقریباً سبھی شعراء یہاں آچکے ہیں میں ذاتی حیثیت میں بھی ماہانہ مزاحیہ مشاعرہ کرواتا ہوں جس میں پاکستان اور انڈین مقامی شاعر بھی شریک ہوتے

پاکستانی شعراء نے بھی ان سے بے شمار مالی فائدے حاصل کیے ہیں ان کے رحلت سے کئی شعراء در بدر بھی ہو گئے ہیں 19 سالوں سے مجلس اردو ادب کی سالانہ تقریب ایوارڈ کا اجراء ملک صاحب کا ہی کا کارنامہ ہے اور پھر مشاعروں کی روداد کو میگزین کی شکل میں لانا بھی ایک بہت اہم کام ہے میں انہیں دل سے خراج تحسین پیش

ادیب کو بھی جنم دیتی ہیں؟

بالکل ایسا ممکن ہے دراصل ماحول ہی اس کی آبیاری کا وسیلہ ہوتا ہے دوحہ کو آج دنیا میں اسی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے کہ یہاں پر اچھی شاعری اور نثر کے حوالے سے بہت کام ہو رہا ہے۔

آپکے خیال میں اس وقت دوحہ کے اہم شعراء کون کونسے ہیں؟

شوکت علی ناز، اعجاز حیدر، منصور اعظمی، اور آصف شفیع انکا ایک ایک شعر بھی دیکھیے۔

فرحت عباس شاہ کو ان کی لائف ٹائم پرفارمنس پر گولڈ اور کیش ایوارڈ بھی ایک کارنامہ ہے

ہیں اور ماحول کو خوب گرماتے ہیں یہاں عوام کی مزاحیہ مشاعروں کی ڈیمانڈ بہت زیادہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سنجیدہ شاعری کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔

کرتا ہوں۔

آپ کے خیال میں مجلس اردو ادب کے ساتھ ساتھ اور تنظیمیں بھی سرگرم عمل ہیں؟

یہ جنوں ہے جو مجھے دشت میں لے جاتا ہے
ورنہ پیاسے تو سمندر کی طرف جاتے ہیں

دوحہ میں ملک مصیب الرحمٰن کے بعد کوئی بڑا نام سامنے آیا ہے جس نے دل و جان سے ادب کے لئے کام کیا ہو اور ادب کی کھیتیاں سیراب کی ہیں

جی بالکل چار اور تنظیمیں بھی سرگرم عمل ہیں ملک مصیب الرحمٰن نے بہت کام کیا ہے مگر اب بھی بہت کام کی ضرورت ہے ملک صاحب کی وجہ سے ہی پاکستانی شعراء

عمر کے سال اور غم حیدرؔ
بڑھتے رہتے ہیں کم نہیں ہوتے

پاکستان ایسوسی ایشن دوحہ زندہ ادب کی حقیقی ترجمانی کر رہی ہے!

واہ وا ملک مصیب الرحمٰن گویا ایک درویش آدمی تھے جنہوں نے دل و جان سے ادب کی خدمت کی ہے اور شاعروں اور انکے خاندانوں کو بھی نوازا ہے دوحہ کی ادبی تاریخ میں اب کوئی ملک مصیب الرحمٰن نہیں ہے

کی بڑے مشاعروں تک رسائی ممکن ہوئی ہے ان شاءاللہ پاکستان ایسوسی ایشن اس مشن کو دل و جان سے جاری رکھے گی۔

کیا عالمی کانفرنسیں یا عالمی مشاعرے کسی بڑے شاعر یا

جو مر چکے ہیں انہیں شوق سے پڑھو لیکن
ہمیں بھی پڑھتے رہو ہم بھی اک کتاب ہیں یار

ہر قدم پر بے ثباتی، ہر نفس کو ہے زوال
کس طرح کی اے مرے ہمدم! یہ دنیا جائے ہے

آپ ذاتی طور پر جدید غزل کے حق میں ہیں یا پھر؟
بالکل میں اس کے حق میں ہوں مگر میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، محسن نقوی اور صبا اختر کا بھی بہت قدر دان ہوں نئی شاعری کے حوالے فرحت عباس شاہ، عباس تابش، شہزاد بیگ اور

تعارف۔ سید فہیم ہاشمی کا تعلق رحیم یار خان سے ہے بسلسلہ روزگار عرصہ دراز سے دوحہ قطر میں مقیم ہیں آجکل پاکستان ایسوی ایشن دوحہ قطر کے چیئرمین ہیں جبکہ عالمی مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر سے دو دہائیوں سے وابستہ ہیں، انہیں اردو ادب سے وابستگی بچپن سے ہے سکول دور میں ہی بزم ادب کے سیکریٹری تھے اور ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے آرہے ہیں، اپنے استاد محترم سلیم الرحمٰن سے محبت اور قربت کے سبب شاعری کی جانب آئے اور پھر واپس نہیں گئے 92 تا 97 چاند میں مزاحیہ شاعری بھی چھپتی رہی ہے اردو کے ساتھ پنجابی میں بھی لکھتے ہیں۔ اب تک گیارہ کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں "یہ پہلا عشق نہیں"، "دربہ در"، "دائرے، نقطے، حرف"، "اداس شہر میں شام"، "ہزل در غزل"، "مزاح کے سرپر"، "بدن سے لپٹا کرب"، "پل پل بکھرا جیون"، "لفظ در لفظ" وغیرہ شامل ہیں جنکی پذیرائی بھی ہو چکی ہے اور داد و تحسین بھی پا چکے ہیں انکی چار کتابیں زیر طبع ہیں جن میں "طفلے"، "غراط۔ فردیات"، "حرف در حرف"، یہ سائنسی ریسرچ ہے جو کہ ایم ایف این پر مشتمل ہے "ایک کتاب انگریزی میں بھی ہے" انکے ہمعصروں میں منان قدیر منان، اشفاق ناصر اور مرشد فہیم ناصر شامل ہیں بہاولپور میں انٹر کالجیٹ بین الاقوامی میں پوزیشنیں بھی حاصل کر چکے ہیں اور آج کل دوحہ قطر میں پاکستان کا نام روشن کر رہے ہیں۔

افضل خان میرے پسندیدہ شعراء کرام ہیں۔
آپ اپنے مشاعروں میں سامعین کا انتخاب کیسے کرتے ہیں؟
دوحہ میں اہل ذوق کی کمی نہیں ہے یہاں اچھے خاصے اہل ذوق موجود ہیں جن کی تعداد پچاس کے قریب ہے یہاں کا ہر شاعر اپنا کلام نہیں پڑھتا میں اور فرتاش سید بھی پہلے پہل یہ مشاعرے سنتے رہے ہیں اس وقت انڈین شاعروں کا یہاں بہت زور تھا یہ صورتحال اب کافی بہتر ہوئی ہے سامعین میں ہم تین سو کے قریب اساتذہ کو بھی مدعو کرتے ہیں جبکہ ۱۲ سال سے چھوٹے بچوں کا یہاں داخلہ ممنوع ہے۔
دوحہ میں جو اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں میں انہیں بھی خراج تحسین پیش کرتا ہوں ہم یوتھ کیلئے بھی لیکچر اور دیگر تربیتی اور اعلیٰ ادبی سرگرمیاں کے ساتھ ساتھ ہم کانفرنسیں کرواتے ہیں تا کہ ان کی بھی تربیت ہو سکے۔

وہ ڈپریشن کا شکار ہوتے ہیں۔
دوحہ میں ہم اس چیز پر بڑی سنجیدگی سے دھیان دیتے ہیں مگر ان مشاعروں میں جینوئن شعراء کی تعداد بھی مناسب ہوتی ہیں۔
کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شاعری معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہے؟
بالکل ہوتی ہے یہ تو شاعر پر منحصر ہے کہ وہ معاشرتی پہلوؤں پر کتنا لکھتا ہے اور کیا لکھتا ہے۔
کیا شاعر معاشرے کی آنکھ ہو سکتا ہے؟
آج کل ہونے والی شاعری میں یہ عمل تیزی سے فروغ پا رہا ہے اور روزمرہ کے معاملات شاعر کی آنکھ عکس بند کر رہی ہے۔
مشاعروں میں اچھا ادب کم کم سننے کو ملتا ہے کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

کیا آپ سمجھتے ہیں مشاعرہ ایک آرٹ کی شکل اختیار کر گیا ہے؟
بظاہر تو یہی لگتا ہے اس سے کاروباری بو آتی ہے جینوئن شعراء کا استحقاق مجروح ہوتا ہے

اگر تو آپ تعلقاتی مشاعروں کو فروغ دیں گے تو ظاہر ہے ری ایکشن بھی سامنے آئے گا اور سامعین بھی بور ہونگے اس پر منتظمین مشاعرہ کو بھی غور کرنا چاہیے اور ادب کی حقیقی خدمت کرنی چاہیے۔

کیا عالمی مشاعرے بڑے شاعروں کو کھا گئے ہیں اور شاعرات کو جنم دے رہے ہیں؟

میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہے اچھا شاعر یا شعر تو خوشبو کی طرح سفر کرتا ہے یہ الگ بات ہے کہ شاعرات کا یہاں زور ہے اور سامعین انہیں پسند کرتے ہیں۔

کیا آپ سمجھتے ہیں نثر کی نسبت شاعری آسان ہے شاعر کا ایک مصرعہ ہی اسے آسمان پر لے جاتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ شاعر کا ایک مصرعہ ہی اسے پر لگا دیتا ہے۔

کلامِ شاعر

قطعہ

گر دل میں تری یاد سے بہلا نہیں سکتا
اتنا تو یقیں ہے کہ جیا جا نہیں سکتا
ہر بات سمجھ کے لئے، سمجھی نہیں جاتی
یہ بات سمجھ سکتا ہوں سمجھا نہیں سکتا

بھنور میں رقص کرنا بھی ضروری ہوگیا تھا
لبِ ساحل بکھرنا بھی ضروری ہوگیا تھا
تو پھر الزام سارے کس لئے سر پر لئے تھے
اگر سب سے مکرنا بھی ضروری ہوگیا تھا
سنبھل جاتا تو یہ ساقی، تری توہین ہوتی
بہکنا اور ڈرنا بھی ضروری ہوگیا تھا
ترے دل میں پڑاؤ مستقل کرنے کی خاطر
ترے دل میں اترنا بھی ضروری ہوگیا تھا
فقط اپنے لئے دو چار پل جینا تھا مجھ کو
سو تم کو یاد کرنا بھی ضروری ہوگیا تھا
ذرا سی مصلحت اور کچھ برائے زندگی بھی
کچھ ایسا ہی، کہ مرنا بھی ضروری ہوگیا تھا

######

فضول ہے بھی تو بے کار ناچنے دے مجھے
یہ آبلے ہیں مرے یار ناچنے دے مجھے
یہ میرا دل ہے کسی اور ہی طرح کا دل
نہ کر تو مجھ سے یہ تکرار ناچنے دے مجھے
مجھے نہیں ہے کوئی غم ترے بچھڑنے کا
نہیں ہے دل پہ کوئی بار ناچنے دے مجھے
میں جانتا ہوں ترے دل پہ چوٹ لگتی ہے
مگر تو پھر بھی سردار ناچنے دے مجھے
تری زمیں کو میں گھنگھرو بنا کے پہنوں گا
اگر فلک پہ تو اک بار ناچنے دے مجھے
ابھی نہ روک اے ساقی بدن کی گردش سے
ہوں اپنے آپ سے بیزار ناچنے دے مجھے
پھر اس کے بعد چاہے سر فہیم کر دے جدا
ابھی نکال نہ تلوار ناچنے دے مجھے

######

کوثر علی، نصرت صدیقی، سید فہیم ہاشمی اور شہزاد بیگ سرکٹ ہاؤس فیصل آباد

سوال میں نے وفا کا اٹھایا تھوڑی ہے
کوئی بھی عہد ہو اس نے نبھایا تھوڑی ہے
ابھی تلک وہ مرے دوستوں میں ہے شامل
ابھی تک اس کو نظر سے گرایا تھوڑی ہے
بدن کا زخم ہے اک روز بھر ہی جائے گا
یہ اس نے ظرف میرا آزمایا تھوڑی ہے
ذرا سی دیر میں منظر بدل ہی جائے گا
کہ اتنا ہوش مجھے راس آیا تھوڑی ہے

کہہ کر چلے جاتے ہیں؛ دیکھا تیرا وعدہ۔''
اُس نے اپنا وہی پرانا جملہ دہرا دیا اور میں خود کو کوس پیٹ کر چلا آیا۔
میں اکثر سوچتا:''اُس کی کیا غلطی...؟ غلطی تو میری ہے کہ میں نے بھروسا کیا اُس پر، اُس کو پہچانا نہیں اور آ گیا اُس کی میٹھی میٹھی باتوں میں۔ آج کے دور میں اعتبار کس کا...؟ دھوکا کھایا، جیسا کیا، ویسا بھر اور لگا چکر صبح و شام، بھگت اپنی غلطی کی سزا...!''
''ہاں بھئی کتنا کام ہوا...؟'' کئی ماہ گزرنے کے بعد پھر پہنچا۔
''ارے بیٹھیے تو...!''
''تمھارے جیسا مکار، جھوٹا، دھوکے باز اور بے ایمان نہیں ہو سکتا دنیا میں۔''
''ارے بیٹھیے تو...!''
میرا کام واپس کر دو اور رقم بھی...! مجھ کو نہیں چاہیے کام۔''
''ارے بیٹھیے تو...!''
میرے پاس وقت نہیں۔''
''ارے بیٹھیے تو...!''
''سُن لیجیے...! اپنی غرض پر، رقم لینے سے پیشتر تو صبح و شام چکر لگاتے تھے، فون کرتے تھے، تمھارے پاس کام نہیں تھا اور جب میں آتا تھا، تب خاطر تواضع کرتے تھے، رقم لینے کے بعد بیل گاڑی، کشتی پر آ گئی۔ تم میرے یہاں آتے ہو کبھی..؟ فون کرتے ہو، اب..؟ پوچھنے آؤ تو، ارے بیٹھیے تو...! ارے بیٹھیے تو...! کی رٹ۔''
''ارے بیٹھیے تو...!''
''تم تو اپنے بھائی سے بڑھ کر نکلے۔ اب میں دو روز بعد آؤں گا، حساب کے لیے۔ اپنا حساب کاٹ کر میرا کام واپس کر دینا، سمجھے...؟''
''ارے بیٹھیے تو...!''
''کیا بیٹھیے تو...! بیٹھیے تو...! کی رٹ لگا رکھی ہے، میں نہیں بیٹھتا۔'' میرا چیخنا اُس کو برا لگا، تو اُس نے بھی ناراض ہو کر میرا کام واپس کر دیا اور دوسرے روز میری رقم واپس کرنے کا وعدہ کر کے مجھ کو چلتا کر دیا۔
ایک دن، دو دن، پھر ایک ماہ، دو ماہ پھر پورے چھ ماہ گزر گئے اور رقم اب نہ تب۔ پھر مجھ کو اُس کے سب سے بڑے بھائی سے ملنا پڑا۔ بے چارے بڑے سلیقے سے پیش آئے۔ آخر کرتے بھی کیا وہ..؟ ہاں اُنھوں نے مجھ کو اتنا ضرور بتایا:''جھگڑے کے فوراً بعد ابو کا کولھا ٹوٹ گیا، ابو اور اُس کو تم سے بدسلوکی کی فوراً سزا مل گئی۔ جس کے سبب دیپو بہت پریشان رہا۔'' اُس کے بھائی کے بتانے پر مجھ کو بھی افسوس ہوا۔ اُس کے بعد بھی کئی ماہ گزر گئے۔ رقم، پھر بھی نہ ملی۔
حالات اچھے نہ دکھے تو میں نے رسوخ استعمال کیے۔ اُس کے بعد بھی دیپو کے کئی وعدے گزر گئے۔ شکنجہ زیادہ کسا تو بے چارے اُس کے ابو بڑے سلیقے سے پوری رقم واپس کر گئے۔
''میں، تمھاری بیوی نہیں کیا...؟'' کافی دنوں بعد جب میں لکھنؤ سے لوٹا تو میری بیوی بہت ناراض۔''
''ہاں ہاں، کیوں نہیں....! مگر بات کیا ہے..؟''
''اگر بیوی سمجھتے، تو کیا چھپاتے اتنی بڑی بات...؟''
''آخر چھپایا کیا میں نے آپ سے...؟''
''ناول اور افسانوی مجموعے کا اتنا بڑا اجرا، کل چھبیس جنوری کو گاندھی بھون میں اور میں بے خبر...!'' میں نے لپک کر کارڈ اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ منجانب میں دیپو کا نام تھا۔

آصف نیاز/لاہور

رہتی ہے آنکھوں میں صورت یار کی
بڑھتی ہی جاتی ہے چاہت یار کی

دل میں رہتی ہے محبت یار کی
اس لیے کرتا ہوں عزت یار کی

دل کے ہاتھوں ہوتا ہوں مجبور جب
کرنا پڑ جاتی ہے منت یار کی

اس لیے لگتا نہیں ہے دل کہیں
پڑ گئی ہے مجھ کو عادت یار کی

میں نے جب دُکھ درد اُس کے لے لیے
دیکھنے والی تھی حیرت یار کی

دنیا سے کیا لینا ہے آصف نیاز
مجھ کو تو کافی ہے نسبت یار کی

شبّو

ثمینہ سیّد/لاہور

فضا آج پھر بوجھل تھی عجب سوگواریت چھائی ہوئی تھی۔ میں چلتا تو پتے یوں پاؤں کے نیچے چرمراتے جیسے رو رہے ہوں۔ بین کر رہے ہوں اور مجھے پاؤں اٹھانا پڑتے غیر ارادی طور پر بھی سنبھلنا پڑتا کہ کہیں میری وجہ سے انہیں تکلیف نہ ہو رہی ہو لیکن ایک میرے سنبھلنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اردگرد چلتے بے فکرے چہروں کو دیکھا جو سب جلدی میں نظر آ رہے تھے۔ چہرے اتنے خالی اور سپاٹ کہ دماغ کے چوپٹ ہونے کے غماز نظر آتے تھے''میں پاگل تو نہیں ہوتا جا رہا'' یہ وہ سوال ہے جو پچھلے کئی سال سے میں اپنے آپ سے کر رہا تھا۔ مگر جواب نہیں ملتا تھا شاید میں ڈھونڈتا ہی نہیں تھا اپنے آپ کو جوابدہ ہونے کا وقت ہی نہیں دے رہا تھا جانتا تھا ناں کہ ذرا جو دل دماغ کی عدالت لگی تو بس جنگ ہی چھڑ پڑے گی یعنی بات نکلے گی تو دور تلک جائے گی یہ جنگ ایسی توڑ پھوڑ کرتی تھی کہ میری ذات بکھرنے لگتی۔ میں جو بڑا رائے احمد حسن زمینوں، جائیدادوں کا مالک امیر اور معزز آدمی بنا پھرتا ہوتا پل بھر میں ذرہ ہو جاتا۔ صفر جو محض دائرہ ہے اور دائرے ہی دائرے خالی خولی میرے اطراف گھومتے رہ جاتے۔ بس اسی لئے بچتا تھا میں خود سے۔ ایم ایس سی کیا ہوا تھا اور ایک پیسٹی سائیڈز کمپنی میں اس لئے جاب کرتا تھا کہ یہ پبلک ریلیشنز کی جاب تھی۔ سارا دن لوگوں سے ملنا ملانا۔ طرح طرح کی ڈیلنگز اور بھانت بھانت کے مزاج مل کر مجھے خود سے ملنے کا وقت نہ دیتے تو یوں مجھے اپنی جاب سے کافی پیار تھا۔ پیار''چلو رات بہت ہو رہی ہے'' میں زیر لب اپنے آپ سے بولا، تاکہ اپنی آواز خود بھی سن سکوں اور کسی اور بارے کچھ نہ سوچوں، وہ لفظ پیار جو میرے ذہن میں آیا تھا آج میں بڑے تک سک سے تیار ہو کر نکلا اور پبلک ٹرانسپورٹ میں آ بیٹھا۔ جس علاقے میں آج جانا تھا وہ خاصا پسماندہ تھا۔ چیکنگ کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ میں جانا لگتا تو عجیب تھا مگر میں اکثر عجیب حرکتیں کرتا رہتا تھا۔ آ کر بیٹھا تو گاڑی چل پڑی خوب شور تھا۔ جگہ جگہ رکتی رنگ برنگی آوازیں مل کر زندگی کو قائم رکھے ہوئے تھیں۔ میں شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر بھی گہما گہمی تھی، زندگی بھاگتی جا رہی تھی۔ تبھی کسی نے چھو کر مجھے متوجہ کیا اور میں نے دیکھا تو جیسے پتھر ہو گیا۔ بے انتہا خوبصورت لڑکی تھی۔ سرخ چمکتا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ ناک میں موتی سی سونے کی لونگ پہنی ہوئی تھی اور خود بھی جیسے دہک رہی ہو۔ میں نے سنبھل کر پوچھا''جی''تو وہ ادا سے مسکرا دی اور ایک کارڈ مجھے تھما دیا پھر میں دیکھتا رہا ایسا ہی کارڈ اس نے بیسیوں لوگوں کو دیا کسی نے اسے سو کا نوٹ دیا کسی نے 50 کسی نے دس بیس۔''کیا ماجرا ہے؟'' میں سمجھ نہیں سکا وہ پھر میرے پاس آ رکی میرا ہاتھ بھی غیر ارادی طور پر جیب میں گیا اور پتہ نہیں میں نے کتنے کا نوٹ دیا وہ دیکھ کر دل سے مسکرا دی اور اتر گئی لوگ اس کے بارے میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔''یہ کون تھی بھائی؟'' میں نے اگلے شخص سے اسی کی زبان میں پوچھا تو وہ استہزاء سے ہنسا اور مجھے دیکھتا رہا''اتنا بھولا تو بابو آج کل کوئی بھی نہیں کارڈ دیکھو سب پتہ چل جائے گا'' مجھے بہت برا لگا میں نے اپنے آپ کو ڈانٹا''آئندہ کبھی بس میں سفر نہیں کروں گا'' کارڈ دیکھے بغیر جیب میں ڈالا اور کڑھتا رہا۔

لیکن رات کو جب سونے کے لیے لیٹا تو وہ سرخ و سفید سنہری بالوں اور سنہری آنکھوں والی چھم سے میری آنکھوں میں اتر آئی میں کچھ دیر پڑا سوچتا رہا کہ کیسی رنگ برنگی دنیا ہے ناں! مالک پاک پروردگار اور پھر اٹھ کر میں نے لٹکی ہوئی پینٹ کی جیب سے کارڈ نکالا (شبو No No) کے ساتھ دو نمبر لکھے تھے میری تو نیند ہی اڑ گئی۔ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور موبائل پر نمبر ڈائل کرنے لگا حالانکہ مجھے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی بالکل بھی نہیں لیکن بس انسانی فطرت میں تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ نمبر ڈائل کرتے کرتے انگلیاں دکھنے لگیں مگر کوئی نہیں تھا ادھر۔

''آخر یہ سب کیا ڈرامہ ہے؟'' میرا دماغ پھٹنے لگا اس کی دلکش صورت آنکھوں سے ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی میں نے دھیرے دھیرے کنپٹیاں دبائیں۔ خود کو ارادتاً ریلیکس کیا اور چادر کھینچ لی۔ آنکھیں بند کیں تو ایبا کی ہنستی کھلکھلاتی شکل بھی آنکھوں کے سامنے اترتی چلی آئی وہ تو روز آتی تھی۔ ہر رات، ہر لمحہ چلتے پھرتے۔ مگر آج پانچ سال بعد کوئی اور صورت بھی مجھے تنگ کر رہی تھی ورنہ تو مجھے لگتا زمانے میں کچھ رہا ہی نہیں نہ نظر اٹھتی نہ کسی چہرے پر

نکتی۔ بس ایبہا کی محبتیں، یادیں، بے وفائیاں ہی ہمراہ تھیں۔ ایبہا میری کلاس فیلو تھی۔ پہلے دن ہی وہ آئی تو کافی گھبرائی ہوئی تھی فارم تک لینے نہ آتے تھے میں نے اخلاقیات نبھاتے ہوئے مدد کردی اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ اخلاقیات محبت میں بدلتی گئیں وہ نہایت عام سی تھی۔ سانولی سلونی بس کالی بھنورا سی بڑی بڑی آنکھیں ہی اس کی طرف سب کو کھینچتی تھیں۔ میں بہت خوبرو، امیر کبیر بقول دوستوں ''شہزادہ'' تھا بالکل۔ مگر مجھے ایبہا ایسی بھائی کہ دل جو سوچ کے آیا تھا کہ یونیورسٹی لائف کو خوب انجوائے کرنا تھا بھول بیٹھا اور ایبہا کی محبتوں پر دوزانو ہوکر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی زیادہ ضد نہ کی اور میرے دل پاگل نے تو حد کردی ایبہا سے محبت کی۔ بات چھوٹی لگے گی مگر میں نے ایبہا کو بہت کچھ دیا، بہت پیار، بہت پیسہ، بہت سی ضروریات اس کے کہے بغیر پوری کردی میں نے وہ، میری ہی بدولت شہر میں سیٹ ہوسکی۔ دھیرے دھیرے اس کا اعتماد بحال ہوتا چلا گیا اور اس کے دوستوں میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے دوستوں میں لڑکوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تو میرا دل پھڑ پھڑانے لگا اور میں نے اسے پرپوز کردیا وہ سر جھکائے مسکراتی رہی اور پھر اتنا ہی بولی ''پڑھائی تو ختم ہولے پھر سوچیں گے'' اور مجھے لگا یہ اقرار تھا اس کی طرف سے۔ اقرار محبت پاکر میں نے امی، ابا جی کو بھی اس کے متعلق بتادیا اور اب تو من ہر وقت ہواؤں میں اڑتا تھا۔ میں محبت کے معاملے میں بالکل روایتی تھا اور مجھے محبتیں اپنی پوری اصلیت کے ساتھ ہی بھاتی تھیں مجھے یاد ہی نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی ایبہا کے سوا کسی کو چاہا ہو۔ ہاں میرے اردگرد نظروں، خواہشوں اور محبتوں کا ہمیشہ میلہ رہا۔ ہر دوسری لڑکی کی آنکھوں میں میرا عکس جھلکتا دکھائی دیتا مجھے اچھا لگتا یہ سب۔ مگر میں نے زندگی کو منصوبہ بندی کے ساتھ گزارنے کا ارادہ کیا تھا سو ہر لمحہ ایبہا کو اپنے گھر میں دیکھتا اور یہ الوژن نجانے کب تک چلتا اگر میں ایبہا کو یہ کہتے نہ سن لیتا۔

''ازہر تم یقین کرو میری آنکھوں میں صرف تمہارے خواب ہیں میں نے کسی اور کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں احمد حسن کے مجھ پر بہت احسان ہیں اسی لئے اس سے بات کرنا پڑتی ہے ورنہ اس جیسے چیکو لوگوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔''

''مگر وہ تو سب سے کہتا پھرتا ہے کہ ہماری شادی ہورہی ہے دو ماہ بعد، ایبہا میں تمہارے بغیر نہیں جی سکوں گا ایبہا پلیز'' اس نے ایبہا کے ہاتھ پکڑے تو وہ میرے دل کی مسند سے دھڑام سے نیچے جاگری اور پھر میں نے ان آخری دو مہینوں میں بہت سے عشق کر ڈالے۔ حسین سے حسین اور امیر ترین لڑکیاں جان دیتی تھیں مجھ پہ، مگر میرے اندر اب کسی کے ساتھ کی تمنا نہیں رہی تھی یونہی ضد میں سب کررہا تھا۔ محبت تو مرگئی بے اعتمادی کی موت۔ میرے کانوں نے ایبہا کو ایسے فقرے بہت سے لڑکوں کے ہاتھ پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتے سنا تھا اور میرے اندر عورت کے خلاف زہر ہی زہر بھر گیا تھا۔ یہ زہر ہی میرا ساتھی تھا۔ امی، ابا جی بہت تنگ کرنے لگے تھے کہ شادی کرلو، بس اب بہت جوگ لے لیا مگر جوگ کا بھی کوئی انت ہوتا ہے میں یہاں شہر میں آبسا۔ اکیلا ہی۔

اگلی صبح میں تیار ہوکے نکلا گاڑی کو چابی لگائی تو وہ دہکتی صورت پھر آنکھوں میں اتر آئی اور نجانے کیا ہوا میں نے بیگ کندھے پہ ڈالا اور گیٹ لاک کرکے نکل آیا بس میں آبیٹھا تو نظریں ادھر ادھر بھٹکتی رہیں آج تو اس کی گوری بانہوں میں سرخ چوڑیاں بھی یاد آرہی تھیں مگر وہ نہیں آئی میرا دل چاہ رہا تھا کسی سے اس کے بارے میں پوچھوں مگر کس سے؟

نجانے کتنے ہی روز میں بسوں میں دھکے کھاتا پھرا، بے مقصد اور پھر میں اپنی گاڑی میں بھی اسی رستے سے آنے جانے لگا۔ ایسے ہی مایوس ہوتے دنوں میں ایک دن وہ نظر آگئی، سیاہ تنگ لباس میں سلور چوڑیوں اور پائل کے ساتھ ناک میں سفید چمکتی لونگ۔ میں دور سے دیر تک اسے دیکھتا رہا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ بس میں چڑھتی میں نے گاڑی زن اس کے آگے روک دی اور وہ اچھل کے پیچھے ہٹی ایک لمحے کو اس نے مجھے دیکھا آنکھوں میں شناسائی چمکی مگر معدوم ہوگئی ''بابو گاڑی ہٹاؤ'' وہ گھرک کر بولی تو میں نے شیشہ نیچے کیا اور سر نکال کر بولا ''تم جھوٹ بیچتی ہو، یہ نمبر تو کسی کے بھی نہیں ہیں۔''

''تمہیں کیا سچ بیچوں کہ جھوٹ؟'' وہ چلائی۔

''مجھے دو یہ سارے کارڈ اور یہ لو نوٹ'' میں نے بہت سارے نوٹ آگے کیے تو وہ غصے سے لال سرخ ہوگئی ''اپنی اوقات میں رہو زیادہ دولت کا رعب نہ دکھاؤ صاحب۔''

''تم یہ کیا کررہی ہو، کیا ہے یہ؟ بھیک مانگنے کا اسٹائل یا پھر......؟'' میں نے اسے تپانے کے لیے فقرا ادھورا چھوڑا تو اس نے سونے جیسی آنکھوں سے مجھے گھورا اور پھر دو چار بھاری سی گالیاں بکیں مگر میری الجھن مجھے ہٹنے نہ دے رہی تھی میں دیکھتا رہا۔

''تم جو چاہتے ہو وہ میں نہیں کرسکتی، بھیک ہی

مانگتی ہوں، بس اللہ پاک نے موہنی صورت دے دی اور کچھ بھی نہ دیا'' وہ رکی لوگ اردگرد جمع ہونا شروع ہو گئے اور میں جیسے کسی انجانی قوت کے زیر اثر تھا گاڑی سے باہر نکل آیا۔

''تم یہ جھوٹے کارڈ کیوں دیتی ہو؟'' میں چلایا تو اور بھی کئی لوگ بولے''ہاں اس نمبر سے تو کوئی بولتا ہی نہیں سندری؟''

''تو جھوٹ بول کے لوٹتی ہے لوگوں کو؟'' کوئی اور بولا تو وہ رو پڑی اور پورے زور سے چلائی۔

''میں جھوٹ بول کے نہ لوٹوں تو لوگ مجھے لوٹ کے نوچ کھائیں، بابو تم نے میرا تماشا ہی بنا دیا۔ اتنے سالوں سے یہ کاروبار کر رہی تھی تم نے سب برباد کر دیا۔ وہ روئے جا رہی تھی میرے دل کو کچھ ہوا میں نے آسمان کی طرف دیکھا، یا اللہ جی معاف کرنا مجھے اس کی بددعا نہ لگ جائے۔''

''تم دھندا کرو بھیک مانگو'' کوئی چلایا میرے بھی دل کی آواز تھی وہ اور زیادہ چلا کر بولی'' کوئی صرف ہاتھ پھیلانے سے بھیک دے گا مجھے؟ میرا بابو کینسر کا مریض ہے سات چھوٹے بہن بھائی اماں مر گئی اور میں ان ساتوں کی ماں بھی ہوں اور باپ بھی۔ مگر بابو تیری یہ دنیا دودھاری تلوار ہے مجھ جیسی کو نہ بھیک دیں گے اور میں اپنے بچوں کو مرتے کیسے دیکھوں؟''

''یہ کارڈ پہ لکھا نمبر جھوٹ ہے بابو تو کیا ہوا ساری دنیا ہی جھوٹ بولے ہے اک میں ہی کیوں مجرم؟'' وہ ابھی بھی رو رہی تھی کافی لوگ شرمندہ نظر آ رہے تھے میں بھی''میں نے سب سچ بتایا ہے کسی نے مجھے دو آنے بھی دیئے؟ سب حرص کا سودا ہے بابو سب اپنی حرص خریدتے ہیں اور بیچتے ہیں میں اپنی موہنی صورت سے تم لوگوں کی جیبوں تک پہنچتی ہوں اور تم لوگ اس نمبر کے ذریعے مجھ تک پہنچنا چاہتے ہو اس وجہ سے غصے میں ہو کہ پہنچ نہیں پاتے، ہاں یہ نمبر جھوٹ ہے مگر میرا اللہ جانتا ہے میں سچ ہوں بالکل سچ۔ میں کوئی غلط کام نہیں کرتی، کر ہی نہیں سکتی بس اس لیے'' وہ پھر ہچکیوں سے رو رہی تھی سب طرح طرح کے فقرے کستے وہاں سے ہٹنے لگے وہ زمین پر بیٹھی ابھی تک رو رہی تھی جو کائنات کے وجود جیسا خالص سچ تھی تبھی تو اس کے چہرے پر اتنا نور تھا کہ نظر ہی نہ ٹھہرتی تھی میں قریب چلا آیا۔

''شادی کرو گی مجھ سے؟''

''بابو'' وہ پوری قوت سے چلائی جیسے میں پاگل ہوں۔

''بولو، میں رائے احمد حسن پڑھا لکھا، کھاتا پیتا نوجوان'' میں ہنسا اور من جیسے شانت ہو گیا اور وہ ابھی بھی منہ کھولے دیکھ رہی تھی اور پھر بے اختیار ہو کر میرے قدموں میں گر گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ میری دوسری محبت ہے میری پہلی محبت جھوٹ تھی اور شبو میرا سچ۔ میں نے پوری سچائی سے اس سے محبت کی میرے اندر کا سارا زہر دھیرے دھیرے زائل ہوتا گیا۔ شبو کی وفاؤں نے میرے اندر زندگی زندہ کر دی اور میں خود سدا کا محبت شناس، شبو کو عزت سے گھر لے گیا امی ابا جی سے کہا کہ دوست کی بہن بیاہ کر لایا ہوں وہ مجسم وفا تھی، کبھی لوٹ کر واپس نہ گئی اپنوں میں۔ میں ہی ان کا خیال کرتا کہ مجھ پہ فرض تھا۔

سہیل یار/ لاہور

اپنی آنکھوں میں حسیں خواب لیے بیٹھا ہوں
زندہ رہنے کے یہ اسباب لیے بیٹھا ہوں

جس کی قیمت کا کسی کو بھی نہیں اندازہ
ایسا اک گوہرِ نایاب لیے بیٹھا ہوں

اب تو اس بامِ فلک کا ہوں ستارہ میں بھی
آج پہلو میں جو مہتاب لیے بیٹھا ہوں

ایک بھی ضرب لگے گی تو یہ بہہ نکلیں گے
بند آنکھوں میں وہ سیلاب لیے بیٹھا ہوں

اب وہی یار ہوئے ہیں مری جاں کے دشمن
اُس کی محفل میں جو احباب لیے بیٹھا ہوں

عبید اللہ نزاکت/ حاصل پور

یہ جو مشکیزے بھر رہے ہیں ہم
ہاں میاں کوچ کر رہے ہیں ہم

وہ تھی خوشبو، بکھر گئی ہے کہیں
رنگ ہیں اور مر رہے ہیں ہم

اے زمانے! ترے برابر سے
سر اُٹھا کر گزر رہے ہیں ہم

دستکوں کا تو خوف اپنی جگہ
آہٹوں سے بھی ڈر رہے ہیں ہم

وہ یقیناً گمان ہے پھر بھی
اُسے محسوس کر رہے ہیں ہم

اندھیرے اُجالے

طلعت سلیم/ برمنگھم

کھڑکی پہ نگاہ جاتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ حسب معمول سامنے کھڑا تھا۔ جانے کون تھا ایک سراپا سا دکھائی دیتا۔ اُونچا لمبا دبلا پتلا سا نوجوان کوئی مہینہ بھر سے یہی ہو رہا تھا۔ میرا ڈیسک اسی جگہ پر تھا کہ میرے اندازے کے مطابق وہ کھڑکی میں سے مجھے کیا سارے کمرے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پہلے تو میں نے خاص توجہ نہ دی لیکن بار بار اسے وہیں بت کی طرح کھڑے دیکھ کر میں چوکنی ہو گئی۔ اب دن کے وقت پردے تو نہیں گرائے جا سکتے تھے۔

تجسس کے تحت اِدھر اُدھر سے سُن گن لینے پر معلوم ہوا اس عمارت میں کرائے کے فلیٹ ہیں جن میں زیادہ تر طالب علم رہتے ہیں۔ اگر وہ طالب علم تھا تو اس پابندی سے مقررہ وقت پر وہاں موجود ہونا کیا معنی؟ کون جانے روزانہ کھڑا ہوتا ہو میں تو وہاں ہفتے میں تین دن ہوتی تھی۔ اس عمارت کا بڑا سا سلیٹی دروازہ سڑک کے دوسری جانب تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں اکثر سوچتی ذرا سی دیر کو کار روک کر کسی بہانے اندر جا کر پتہ تو لگاؤں، کچھ کمرے کے محل وقوع کا بھی اندازہ تھا۔ جب اگلے مہینے بھی یہ تسلسل نہ ٹوٹا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

ایک روز میں سچ مچ ہی کار روک کر دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ استقبالیہ کا نمبر دبانے پر گیٹ کھلا اور میں اندر جا کھڑی ہوئی۔ بہانہ تو اچھا سا مضبوط گھڑ کے آئی تھی۔ معلوم ہوا عمارت کے مالک فاروقی صاحب ہیں جو اس وقت خوش قسمتی سے وہاں موجود تھے۔ جی مجھے معلوم ہوا آپ فلیٹ کرائے پر دیتے ہیں۔ بہت اچھی بلڈنگ ہے اور محل وقوع تو بہت اچھا ہے۔ مجھے اپنے بیٹے کے لیے فلیٹ چاہیے کیا میں کچھ فلیٹس دیکھ سکتی ہوں؟ میں نے تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔ ''جی ہاں! کیوں نہیں۔ قریب ہی کمپیوٹر پر جھکے ہوئے نوجوان کو انہوں نے بلایا کہ وہ مجھے اوپر کی منزل پر لے جائے۔ تیسری منزل کی راہداری سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے آفس کی عمارت سامنے نظر آنے لگی۔ اندازے سے ایک فلیٹ کے دروازے پر رک کر پوچھا اس وقت سارے مکین تو کام پر ہوں گے۔ کوئی خالی فلیٹ ہو تو میں ذرا اندر سے دیکھ لوں۔ جی ہاں! دو تین ابھی ابھی خالی ہوئے ہیں۔ اس نے ایک دروازے کو چابی لگائی۔ اندر جا کر سرسری سا جائزہ لینے کے بعد میں کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اُف اللہ! ہماری عمارت کے کمرے بالکل سیدھ میں تھے۔ تو اس کمبخت کی نظر سے کچھ بھی چھپا نہ رہتا ہوگا۔ زیادہ تر طالب علم ہی رہتے ہوں گے۔ میں نے بات بڑھانے کے لیے کہا۔ ''جی ہاں! صاف ستھرے نئے فلیٹ ہیں سستے بھی ہیں۔ ان کے لیے بڑے موزوں رہتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں فلیٹس کے نمبر نوٹ کر لیے تھے۔ میرے خیال میں وہ 12 نمبر میں رہتا تھا۔ کیونکہ 6 نمبر والا خالی فلیٹ دیکھتے ہوئے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ 12 نمبر فلیٹ میں رہتا ہوگا۔ جو میرے کمرے کے عین متصل تھا۔

بہت اچھا فلیٹ ہے۔ میرا بیٹا یقیناً بہت خوش ہوگا۔ میں اسے ساتھ لے کر آؤں گی۔ یونہی بات بنانے کے لیے کہہ دیا'' اپائنٹمنٹ لے لوں گی۔ آپ بغیر اپائنٹمنٹ کے بھی آئیں تو دکھا دوں گا۔ آنٹی۔'' فاروقی صاحب خوش ہوں گے کرائے پر لگ جائے گا خالی فلیٹ۔ بڑا خوش مزاج اور کسی قدر باتونی سا نوجوان تھا اسی لیے حوصلہ پا کر میں نے بات آگے بڑھائی۔ میرا بیٹا بڑا نخریلا سا ہے۔ سو سو طرح سے جانچے گا جو دل کو بھایا اسی پہ اَڑ جائے گا۔ کوئی بات نہیں۔ آخر دو تین برس رہنا ہے دیکھ بھال کر ہی لے گا نا۔ چلتے چلتے 12 نمبر کے قریب رُک کر یونہی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا اوہو بھئی! کیا خوبصورت نظارہ ہے اس پچھواڑے کی بالکنی سے۔ میرے بیٹے کی سالگرہ 12 دسمبر کو ہوتی ہے۔ اچھا یعنی 12 - 12 اس نے ہنستے ہوئے کہا اور اس کا لکی نمبر بھی 12 ہے۔ یہی فلیٹ مل جائے تو کیا بات ہے لیکن اس میں تو کوئی رہتا ہوگا نا۔ جی پچھلے سال آیا تھا یہ طالب علم۔ بس چند ماہ کے بعد چلا جائے گا۔ سال بھر کے لیے رہنا ہے اسے۔ بڑا بیبا لڑکا ہے پڑھائی اور صفائی دو ہی کام ہیں شیشے کی طرح چمکتی ہے ہر شے۔ ورنہ لڑکے آپ جانیں کہاں خیال رکھتے ہیں کاٹھ کباڑ پھیلائے رکھتے ہیں۔ خاک بیبا ہے میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ بدذات کھڑکی میں کھڑا جھانکتا رہتا ہے۔ ایک لفنگا ہوگا۔ ذرا سامنے آئے تو کان کھینچوں گی۔ بلکہ فاروقی صاحب کو سارا قصہ سنا کر نکلوا دوں گی یہاں سے۔ مجھے پھر غصہ آنے لگا۔ سارا کچا چٹھا کھولوں گی۔'' کیا یہ والا فلیٹ ہم اندر سے دیکھ سکیں گے۔'' میں نے کہا نا بڑا بیبا لڑکا ہے لیکن آپ کو اپائنٹمنٹ بنانا ہوگی اس

طرح میں اسے کہہ سکوں گا یہاں موجود ہے۔ سب کچھ کس عمدہ طریقے سے ہو رہا تھا۔ یہ اسد تو بڑے کام کا نکلا۔ ڈرامہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھیک دو ہفتے بعد میں وہاں جا پہنچی۔ کہاں کا بیٹا اور کہاں کی کرایہ داری۔ فرضی بہانہ خوب کام کر رہا تھا۔ میرا بیٹا نہیں آ سکا ایک دم سے ضروری کام آن پڑا۔ میں نے کہا وقت طے کیا ہے وہ لڑکا بھی انتظار کر رہا ہوگا۔ کم از کم میں اچھی طرح سے دیکھ آؤں! بہت اچھا کیا آنٹی شہریار آپ کا انتظار کر رہا ہے شام کو اسے کہیں جانا ہے۔

اسد نے دروازے پر دستک دی۔ کھلنے پر وہ سامنے کھڑا تھا۔ دراز قد، دبلا پتلا سا شہریار۔ بلاشبہ یہ وہی تھا۔ السلام علیکم! میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے بھولے بھالے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ اچھا تو یہ ہے شہریار۔ میں نے اپنا غصہ اندر ہی اندر دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

یہ کیا۔ وہ تو ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے جا رہا تھا جیسے وہاں اس کی اس کیفیت کو دیکھنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ ''آئیں آنٹی آئیں'' میرا دل چاہا منہ نوچ لوں کمینے کا۔ اچھی طرح جانتا ہے میں وہی ہوں جسے کھڑکی میں کھڑا ہو کر دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی ماں برابر ہوں شاید دور سے اسے اندازہ نہ ہو پاتا ہو۔ میں بہت سی آنٹیوں کی طرح بھاری بھرکم تو ہوں نہیں صوفے پر بیٹھتے ہوئے میں نے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ عجب سے عالم شوق میں دیکھے ہی جا رہا تھا میری طرف۔ عجیب سی خوشی پھوٹ رہی تھی اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے۔ پاگل لگتا ہے...... بیوقوف۔ ہم فلیٹ دیکھ لیں جلدی سے، ''ذرا دم تو لیں آنٹی، میں چائے لاتا ہوں'' نہیں شکریہ! کھڑکی، اسی مخصوص کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے رکھائی سے کہا میں نے۔ اب یہ کھڑکی کے قریب پہنچے تو خبر لیتی ہوں لیکن بات کیسے شروع کروں گی۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ بات کا بتنگڑ نہ بن جائے۔ میں آگے بڑھی اور...... اور یہ کیا، سامنے دیوار پر نظر پڑتے ہی میں ٹھٹکی۔ یہ تو میری تصویر ہے اور دوسری طرف، ارے یہ ایک اور...... میں پریشان ہو کر اس کی جانب مڑی۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ ''اچھا تم روزانہ......'' ''آنٹی......!'' میری بات کاٹتے ہوئے بولا'' یہ میری امی کی تصویریں ہیں۔ آپ کو لگا نا آپ کی ہیں۔ آپ میری امی جیسی ہیں۔ وہ بالکل آپ جیسی تھیں۔ بالکل ہو بہو آپ جیسی۔ اپنی بھیگی پلکیں اوپر اُٹھاتے ہوئے بولا میں بھونچکی رہ گئی۔ ''اُف اللہ! میں آپ کو کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھا کرتا ہوں۔ آپ خود یہاں آ گئیں کتنا اچھا ہوا۔ آپ کو دیکھتے ہوئے مجھے یوں لگتا تھا میری امی سامنے بیٹھی ہیں۔'' اس نے ایک دم سے میرے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر چوم لیے۔'' میں گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پر پھیلی اُداسی اور خوشی کا امتزاج تھا میں نے ہاتھ نہیں کھینچا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ''میں چار سال بعد ان سے ملنے جانے والا تھا امتحان کے بعد۔ مگر وہ چلی گئیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئیں آنٹی۔ میں نے ان کا چہرہ بھی نہ دیکھا آخری بار۔ کیسا معصوم سا لگ رہا تھا۔ جیسے کم سن بچہ ہو۔

''میں تم سے ملنے آتی رہوں گی میرے بچے!'' دل میں اُبلتے ہوئے ممتا کے جذبے سے سرشار اس کی پیشانی چومتے ہوئے میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

مظفر حسن منصور

وداعی نظم

(عزت مآب جناب پروفیسر سید مظفر حسین کاظمی سابقہ پرنسپل گورنمنٹ کالج جوہر آباد کے تبادلے کے موقع پر (ترمیم و اضافہ کے بعد)

آج کالج کی فضا میں ہے اُداسی کا سماں
ہر طرف پھیل رہا ہے غمِ فرقت کا دھواں
دُھندسی دن کے اُجالے میں ہے یا شام فراق
جانے کس کرب سے دو چار ہوئے ہیں مشتاق
طالب علم نظر آتے ہیں بے چین اُداس
ان کی باتوں میں وہ شوخی ہے نہ لہجے میں مٹھاس
جوہر آباد کے اے محسنِ اعظم منظر
تیرے باعث ہوئی یاں روشنیٔ علم و ہنر
تو نے پیدا کیے کیا کیا نہ وفا کے ساماں
کون سمجھے گا ترے بعد محبت کی زباں
دورِ ماضی کے طلسمات میں کھو جائیں گے
ہم اندھیروں میں تری یاد سے ضو پائیں گے
وہ تری کوششِ پیہم وہ ترا فکرِ بلند
جس نے کھولا تھا یہاں علم کا دروازہ بند
اہلِ مکتب پہ وہ یکساں ترا الطافِ عمیم
جیسے غنچوں کی زباں چومتی ہے بادِ شمیم
تو نے ویرانے کو سینچا ہے لہو سے اپنے
ورنہ دیوانے سدا دیکھتے رہتے سپنے
تو نے سمجھائے پنپنے کے جہاں میں انداز
تیری ہمت نے جوانوں کو عطا کی پرواز
نہ ہوا تیرے عزائم میں تزلزل پیدا
خارزاروں میں کیا نغمۂ بلبل پیدا
کبھی فردوسِ نظر تھے در و دیوار اس کے
آج افسردہ ہیں کتنے گلِ بے خار اس کے
اتنا دلکش مرے کالج کا نظارا نہ رہا
کیا کریں اہلِ چمن جب چمن آرا نہ رہا

(۲۲ ستمبر ۱۹۶۴ء)

طارق اسد/لاہور

. سنوں گا میں ہوا کی سرسراہٹ — ترے آنے کے دھوکے میں رہوں گا

کنجِ تاریک سے اُٹھایا گیا
پھر کہیں روشنی میں لایا گیا
آگ، پانی، ہوا ہوں، مٹی ہوں
اس سے آگے نہیں بتایا گیا
جنس نایاب بھی کہا مجھ کو
اور مرا بھاؤ بھی گھٹایا گیا
پھینک کر مجھ کو آبِ سرکش میں
تیرنے کا ہنر سکھایا گیا
میں کہیں اور تھا بہت مصروف
کھینچ کر اس نگر میں لایا گیا
کرچی کرچی تھا آئینہ جس میں
عکس میرا مجھے دکھایا گیا

نکالی جا چکیں جانیں ہماری
کہیں بھی پھینک دو لاشیں ہماری
بہت دلکش تھے خال و خد ہمارے
تو کہیں بگڑی ہیں یہ شکلیں ہماری
وہ سورج ہے تو لائے تاب اپنی
اُڑا لیتا ہے کیوں کرنیں ہماری
ہم اپنے آپ سے لپٹے ہوئے ہیں
کوئی دیکھے ملاقاتیں ہماری
کہاں ہم ہیں، کہاں عرشِ معلیٰ
پہنچ پاتی نہیں آہیں ہماری
زماں کی قید سے نکلے ہوئے ہیں
کہیں دن ہیں نہ اب راتیں ہماری

سنائیں گے اسے قصہ وفا کا
وہ سمجھے گا نہیں باتیں ہماری
اُٹھائیں گے علم دانتوں سے ہم بھی
وہ کاٹے گا اگر بانہیں ہماری

صرف کافی نہیں فنا مجھ کو
عشق! کچھ اور بھی سکھا مجھ کو
یاں تو ہر شکل میری شکل پہ ہے
تو کہیں اور بھیجتا مجھ کو
تیرا پرتو ہوں، تیرا عکس ہوں میں
مت کسی اور سے ملا مجھ کو
میں فلک کی طرف لڑھک جاؤں
اتنا اُونچا تو مت اُڑا مجھ کو
آبِ منہ زور تھا کوئی ایسا
لے گیا کھینچتا ہوا مجھ کو
تجھ میں ہوتا اگر جنوں کوئی
تو سرِعام چومتا مجھ کو
مجھ میں کیا عیب تو نے دیکھ لیا
تو جو کہتا ہے پارسا مجھ کو
دیکھ! اُٹھا نہ جائے گا مجھ سے
اتنا نزدیک مت بٹھا مجھ کو
کام تو دے دیے ہزار مجھے
وقت تھوڑا مگر دیا مجھ کو

لکھا ہوا ہوں جہاں بھی مٹا دیا جاؤں
میں جس کا قصہ ہوں اس کو سنا دیا جاؤں
جہانِ فردا کا میں لمحۂ غنیمت ہوں
سو ہر کسی کو میں سارا سنا دیا جاؤں
بلند ہونے لگا ہوں زمیں کے سینے سے
میں آسمان کی جانب جھکا دیا جاؤں
یہی تو سوچ کے خود کو اُٹھائے پھرتا ہوں
کبھی تو سامنے اس کے بٹھا دیا جاؤں
زماں کے بوجھ سے خم کھا گئی کمر میری
اب اور کتنا ہوں باقی بتا دیا جاؤں

تصور کا دیا روشن کروں گا
میں ان دیکھے جہانوں میں پھروں گا
جو لاکھوں سال پہلے ہو چکی ہیں
وہ باتیں بھی کسی دن میں سنوں گا
ابھی اپنا نظارہ کر رہا ہوں
وہ آیا تو اسے بھی دیکھ لوں گا
مرا لشکر عدو سے مل گیا ہے
میں کتنی دیر تک تنہا لڑوں گا
سنوں گا میں ہوا کی سرسراہٹ
ترے آنے کے دھوکے میں رہوں گا

آفتاب احمد/فیصل آباد

سمجھ رہے تھے سبھی میں اسے جلا رہا تھا
مگر چراغ کو مَیں نیند سے جگا رہا تھا

دھنک مزاج تھی، زخموں کو پھول کر رہی تھی
وہ سبز آگ جو مجھ میں حلول کر رہی تھی
بہت کیا مرا انکار پھر بھی یہ دنیا
بڑے ہی چاؤ سے مجھ کو قبول کر رہی تھی
میں ہنس رہا تھا ستارے سجا کے پلکوں پر
عجب خوشی تھی جو دل کو ملول کر رہی تھی
میں لکھتا جاتا تھا اُس کو غزل کے مصحف میں
بہ شکلِ شعر جو آیت نزول کر رہی تھی
میں سیدھی راہ پہ آیا ہوں لغزشوں کے سبب
ستم یہ مجھ پہ مری کوئی بھول کر رہی تھی
نہ جانے کون سے رستے کی گرد تھی احمدؔ
جو عمر بھر کی مسافت کو دھول کر رہی تھی

آنکھ، لگتا تھا کہ بینائی سے خالی ہوئی ہے
تجھ کو دیکھا ہے تو اب دیکھنے والی ہوئی ہے
کوزہ گر نے مجھے کس خاک سے تجسیم کیا
جھڑتی رہتی ہے کہیں جتنی سنبھالی ہوئی ہے
میں رہا ہو کے بھی زنداں سے نہیں ہوں باہر
کیسی زنجیر مرے پاؤں میں ڈالی ہوئی ہے
روز اک نقش بناتا ہوں مٹا دیتا ہوں
ذوقِ تعمیر میں تخریب بھی پالی ہوئی ہے
جو نہ ہوتا تھا وہی کام ہوا ہے اب کے
جو نہ بنتی تھی وہی بات بنا لی ہوئی ہے
ختم ہو جاتے ہیں جس موڑ پہ رستے سارے
میں نے اُس موڑ سے اک راہ نکالی ہوئی ہے
ایک محشر ہے جو ہر وقت بپا ہے مجھ میں
اک قیامت ہے ابھی سر سے جو ٹالی ہوئی ہے
اب تلک ہیں جو پر و بال سلامت میرے
اُس کا باعث بھی مری بے پر و بالی ہوئی ہے
آفتابؔ اپنی چمک چاند کو سونپی میں نے
بجھ کے بھی رات بہر حال اُجالی ہوئی ہے

بہتا بھی کس طرح کہ روانی تو ہے نہیں
دریا میں ایک شور ہے پانی تو ہے نہیں
بے رنگ و بو ہوں اور مجھی سے ہے رنگ و بو
مجھ بے نشاں کی اور نشانی تو ہے نہیں
جتنا جتا رہے ہو بگولوں پہ اپنا حق
اس درجہ تم نے خاک بھی چھانی تو ہے نہیں
آنسو پلٹ کے آنکھ میں واپس نہ آئے گا
ہجرت ہے دوست نقل مکانی تو ہے نہیں
ایسا نہیں کہ صرف ہے لکنت زبان میں
آنکھوں میں بھی یقین دہانی تو ہے نہیں
دہرا نہیں سکوں گا وضاحت کے ساتھ میں
فرقت کا سانحہ ہے کہانی تو ہے نہیں
میرا بدل نہیں ہیں ستارے، قمر، چراغ
میں آفتابؔ ہوں مرا ثانی تو ہے نہیں

کسی لہجے نہ رگِ سازِ رواں سے آیا
لفظ میں حُسن مرے حُسنِ بیاں سے آیا
میں تو خود اپنی کہانی میں نہیں ہوں موجود
یار تو میری کہانی میں کہاں سے آیا
ہر بنی بات نہ بننے سے بنی ہے میری
کارِ دنیا بھی مجھے کارِ زیاں سے آیا
کرچیاں میری کوئی جوڑ سکے گا کیسے
میں تو ٹوٹا ہوا آئینہ گراں سے آیا
اب سنا ہے کہ وہی لوگ ہدف ہیں اُس کا
مجھ تلک تیر ہے جس جس کی کماں سے آیا
کچھ نہیں اور تو محرومیاں مٹھی میں سہی
ہاتھ خالی تو نہیں میں بھی دکاں سے آیا
یعنی دریا کا کسی دشت سے رشتہ ہے ضرور
ذائقہ ریت کا بھی آبِ رواں سے آیا
راہ جاتی ہے خرد ہی سے جنوں کی جانب
میں تیقن کی طرف وہم و گماں سے آیا
وہ خد و خال سے ممکن ہی نہیں تھا احمدؔ
مجھ پہ جو رنگ نہ ہونے کے نشاں سے آیا

سمجھ رہے تھے سبھی میں اسے جلا رہا تھا
مگر چراغ کو مَیں نیند سے جگا رہا تھا
اس آسرے نے تو کمزور کر دیا ہے مجھے
کہ میرا ضعف، مرا حوصلہ بڑھا رہا تھا
چپک گئی تھی اگرچہ زبان تالو سے
میں خامشی کو مگر بولنا سکھا رہا تھا
یہ امتزاج ہی شاید ہمیں بہم کر دے
میں اپنا خواب ترے خواب میں ملا رہا تھا

تہمینہ راؤ/آسٹریلیا

دُہائی دے رہا ہے میرا ملبہ
میں تیری آنکھ میں بکھری پڑی ہوں

کیا بتائیں اک ستمگر سے عداوت کیا ہوئی
اک بتِ کافر سے تھی ہم کو بغاوت کیا ہوئی
تن ردائے برف میں لپٹا ہوا ہے آج کل
وہ ترا سورج کدھر ہے وہ تمازت کیا ہوئی
خود کلامی کا بھرم جاتا رہا اب کس طرح
آئینہ پتھر ہوا ہم کو ندامت کیا ہوئی
ایک نقشِ بے دلی دل پر ازل سے ہے بنا
زندگی تو کیا ہوئی تیری ضرورت کیا ہوئی
یہ نئی لاشیں کہاں سے آ گئیں پھر سامنے
کل لگی جو شہر میں دن بھر عدالت کیا ہوئی
کاسئہ اہلِ وفا خالی پڑا ہے اب تلک
وہ بنامِ عاشقی تیری سخاوت کیا ہوئی
آج تہمینہ ہوا ہے دل کو جانے کیا مرے
یاد بھی اُس کی نہیں ہے پھر یہ حالت کیا ہوئی

زمیں پر اس لیے ہی آ گری ہوں
ستارے کی طرح ٹوٹی ہوئی ہوں
میں خود کو مارنے پر تُل چکی تھی
میں خود سے بھاگ کر زندہ بچی ہوں
دُہائی دے رہا ہے میرا ملبہ
میں تیری آنکھ میں بکھری پڑی ہوں
مجھے تسخیر کرنا تھا زمانہ
میں اپنے ہی مقابل آ گئی ہوں
تری صورت نگاہوں میں بسی ہے
میں دنیا میں تجھی کو دیکھتی ہوں

رابطے سے نکل گئے ہو تم
آئینے سے نکل گئے ہو تم
سب نے زادِ سفر اٹھا پھینکا
قافلے سے نکل گئے ہو تم
آج سمجھی فنا ضروری ہے
حافظے سے نکل گئے ہو تم
حیرتیں کر چکیں سفر پورا
واقعے سے نکل گئے ہو تم
اب توازن میں کچھ نہیں شاید
دائرے سے نکل گئے ہو تم
آج سوچا تھا تم سے بات کروں
فاصلے سے نکل گئے ہو تم
کھو گئی ہے کہیں پہ تہمینہ
حاشیے سے نکل گئے ہو تم

محبت کس کو کہتے ہیں عداوت کس کو کہتے ہیں
بچھڑ کر تم سے جانا ھے قیامت کس کو کہتے ہیں
اسی ضد میں ہی اُتری ھوں قیامت خیز لہروں میں
کہ دیکھوں گی محبت میں کرامت کس کو کہتے ہیں
زمانہ پوچھتا کچھ ھے بتاوں اور ہی کچھ میں
تمہی سے میں نے سیکھا ہے وضاحت کس کو کہتے ہیں
ابھی خاموش بیٹھی ہوں مگر میں وقت پڑنے پر
زمانے کو بتا دوں گی بغاوت کس کو کہتے ہیں
ہزاروں درد سہہ کر بھی یہ دیتے ہیں دعا سب کو
کہ اہلِ عشق سے سیکھو سخاوت کس کو کہتے ہیں

کیسے کیسے خواب دکھانے پڑتے ہیں
یونہی عشق میں نام کمانے پڑتے ہیں
جانے والے ہم کو ہجر کی راتوں میں
اشکوں سے بھی دیپ جلانے پڑتے ہیں
دل کا کمرہ وحشت سے بھر جائے تو
دیواروں سے نام مٹانے پڑتے ہیں
ہونٹوں پر جب چپ کے پہرے لگ جائیں
آنکھوں سے پھر گیت سنانے پڑتے ہیں
یہ دنیا تہمینہ کیسی دنیا ہے
کیسے کیسے لوگ گنوانے پڑتے ہیں

تنہائی میں باتیں کرتی رہتی ہوں
ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتی ہوں
تم سے دل کی بات تو کہہ دوں لیکن میں
اپنے آپ سے کتنا ڈرتی رہتی ہوں
جس دن تم سے بات نہیں ہو پاتی ہے
لمحہ لمحہ پل پل مرتی رہتی ہوں
شاید میری غلطی سے تم روٹھے ہو
خود پر ہی الزام میں دھرتی رہتی ہوں
جیسے تیری یادوں سے بچ جاوں گی
خود کو میں مصروف ہی کرتی رہتی ہوں

تہمینہ راؤ کا پہلا شعری مجموعہ
"مجھے یاد کرنا"
شائع ہو گیا ہے
ناشر: نستعلیق مطبوعات
0300-4489310

دوبئی کا پاکستان سنٹر

عامر بن علی/ جاپان

دوبئی کا پاکستان سنٹر دیکھ کر ذہن میں ماضی کے لاہور کا گوئٹے انسٹیٹیوٹ، برٹش کونسل اور امریکن سنٹر ابھرتا ہے۔ پاکستان سنٹر ان تمام مذکورہ اداروں سے زیادہ کشادہ، متنوع اور کئی لحاظ سے بہتر ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ادارہ متحدہ عرب امارات میں مقیم پاکستانیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک ایک اینٹ اکٹھی کر کے تعمیر کیا ہے۔ اس کے عظیم الشان آڈیٹوریم میں ایک ہزار افراد بخوبی سما سکتے ہیں۔ بوقت ضرورت اسے ٹینس اور باسکٹ بال کے میدان میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ جدید ترین ساؤنڈ سسٹم اور سٹیج سے مزین یہ ہال پاکستانی تارکین وطن کی اکثر تقریبات کا اب مرکز ہے۔ آڈیٹوریم کے سامنے جدید طبی سہولیات سے آراستہ میڈیکل کیئر سنٹر اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ اس اسپتال میں متحدہ عرب امارات میں مقیم مستحق پاکستانیوں کا مفت علاج کیا جائے گا۔ خوبصورت مسجد، اور بحالی مرکز بھی اس منصوبے کا اہم حصہ ہیں۔ مگر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ پاکستان سنٹر میں قائم اردو لائبریری ہے۔ نیاز مسلم لائبریری کے نام سے قائم یہ کتب خانہ مشرق وسطیٰ میں اردو کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ لائبریرین خاتون صائمہ ریاض نے جدید خطوط پر قائم اس لائبریری کا ہمیں تفصیلی تعارف کروایا اور اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ وہ اس ادارے کو مشرق وسطیٰ میں اردو کتب کا ایک مثالی مرکز بنانا چاہتی ہیں، ایک ایسی اردو لائبریری جہاں بیٹھ کر آپ کو پاکستان کی مہک آئے۔ اس کشادہ لائبریری میں بہت اعلیٰ معیار کے ادبی اجتماع بھی منعقد ہوتے ہیں۔ میرے میزبان شاعر دوست امجد اقبال امجد نے بتایا کہ پچھلے دنوں بھی پاکستانی شعراء کو یہاں مدعو کیا گیا تھا۔ پاکستان کے تقریباً تمام نامور شعراء اس لائبریری میں اپنا کلام سنا چکے ہیں۔ مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات درج کرنے کے بعد میں نے بھی اپنا اشعار پیش کیے۔

یہ باتیں میں اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ پاکستان سے باہر پاکستانیوں کا قائم کردہ ایسا خوبصورت ادارہ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھا، گرچہ میں درجنوں ممالک گھوم چکا ہوں۔

پاکستان ایسوسی ایشن دوبئی کے زیر انتظام پاکستان سنٹر میں داخل ہوں تو سامنے قائداعظم، علامہ اقبال اور مقامی حکمرانوں کی تصاویر کے ساتھ پاکستانی پرچم دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس ادارے کا استقبالیہ اعلیٰ معیار کے بین الاقوامی نجی اداروں جیسا ہے۔ جس میں انتظار گاہ ایسی خوبصورت ہے کہ دل چاہتا ہے گھنٹوں کتابوں اور پاکستانی رسالوں کا یہاں بیٹھ کر مطالعہ کیا جائے، جو کہ انتظامیہ نے چہار اطراف شیلف میں اردو قارئین کے لیے سجا رکھے ہیں۔ سفارت خانے کا اسٹاف تو کسی بھی ملک کا ہو، اور کہیں بھی متعین ہو، عموماً افسرانہ مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ اکثر اہلکار متکبرانہ انداز میں بات کرتے اور ملتے ہیں۔ تمام لوگوں سے ایک فاصلہ رکھ کر ملنا شاید ان کی تربیت اور غیر دوستانہ رویہ دنیا بھر کے سفارتی عملے کا خاصہ شمار ہے۔ تارکین وطن پاکستانی اور ان کے قائم کردہ ادارے مجھے اس لیے بھی بہت اچھے لگتے ہیں کیونکہ وہ پاکستان کی دیار غیر میں ایک خوبصورت تصویر پیش کرتے ہیں۔

یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ دوبئی میں گیارہ پاکستانی اسکول قائم ہیں۔ عمومی معیاری تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ سارے ادارے پاکستانی ثقافت کے فروغ کے لیے بھرپور انداز میں کام کر رہے ہیں۔ میں ان تمام اداروں کا دورہ تو نہیں کر سکا مگر تہہ دل سے ان کا مشکور ہوں کیونکہ یہ میرے ملک کی زبان پڑھا رہے ہیں۔ میری ثقافت کو رواج دے رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو میں ان کو پاکستان کا حقیقی سفیر سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک سرد ہاتھ کی تین انگلیوں سے ڈھیلا سا مصافحہ کرنے والا ایمبیسی کا افسر میرے ملک کا اصل نمائندہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہم لوگ تو بڑے گرمجوشی سے ملنے والے، محبت کرنے والے لوگ ہیں۔

اسی محبت کا اظہار پاکستان ایسوسی ایشن کے ادبی فورم کا میرے اعزاز میں دوبئی کے گرینڈ حیات ہوٹل میں ایک شعری نشست کا انعقاد تھا۔ عصر تا مغرب یہ محفل شاندار اور یادگار رہی۔ معتبر اور نوآموز شعراء کرام کا ڈھیر سارا کلام سننے کا موقع ملا، تارکین وطن کی شاعری کے موضوعات عموماً دیس میں بسنے والے شعراء کرام سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ منطقی سی بات ہے کہ ان کے گرد پیش کا ماحول چونکہ پردیس کا ہوتا ہے۔ رمضان المبارک کی نسبت سے شاعر دوستوں نے حمد اور نعت کے شعر بھی پیش کیے۔ عید کرنے کے لیے مجھے پاکستان پہنچنا تھا اس لیے گرینڈ حیات ہوٹل کی تقریب سے سیدھا ایئر پورٹ روانہ ہو گیا مگر دوبئی کے پاکستان سنٹر کی خوبصورت یادیں میرے ساتھ رہیں گی۔ قارئین کرام، اور بالخصوص اہل قلم پاکستانیوں سے یہ درخواست ہے کہ اگر ممکن ہو تو پاکستانی زبانوں کی کتب تحفتاً دوبئی کے پاکستان سنٹر میں قائم نیاز مسلم لائبریری کو ارسال کریں۔ بہت سے قارئین کے لیے شاید یہ بات انکشاف کا درجہ رکھتی ہو کہ یو اے ای میں اردو قومی زبان کا درجہ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ستر لاکھ کی کل آبادی میں پندرہ لاکھ پاکستانی اور اٹھارہ لاکھ ہندوستانی اردو بولتے ہی، بہت سے مقامی عرب نہ صرف اردو بولتے اور لکھتے ہیں بلکہ کئی صاحب دیوان شاعر بھی ہیں۔ ڈاکٹر فاروق کے تو پچاس سے زائد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آج کا متحدہ عرب امارات پاکستانی تارکین وطن کے لیے وطن سے دور وطن کی خوشبو کی عملی تصویر پیش کر رہا ہے۔

فیری میڈوز اور وادی ہنزہ

ایم-آر-شاہد/لاہور

بڑی عید کے بعد سالانہ سیر وتفریح کے لئے اس بار دوستوں نے فیری میڈوز اور وادی ہنزہ کا پروگرام بنایا۔24 اگست 2018ء بروز جمعہ صبح چار بجے ہم فیصل موور کی بس کے ذریعے لاہور سے راولپنڈی صبح ساڑھے نو بجے پہنچے۔وہاں سے ہمیں گلگت جانا تھا اس سے قبل ہم نے اسلام آباد کراچی اڈے پر ناشتہ کیا جب گلگت رائے کوٹ جانے والی گاڑی کا پتہ کیا تو علم ہوا کہ شام پانچ بجے جائے گی۔ہمارے پاس کافی ٹائم تھا۔اس دوران مجھے خیال آیا کہ اپنے بزرگ دوست مشتاق احمد آزاد مرحوم کی بیگم کی خیریت دریافت کی جائے اس سلسلہ میں، میں نے ان کے صاحبزادے میجر (ر) اعجاز سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنی بیٹی کے ہاں ایف ڈبلیو او کالونی میں قیام پذیر ہیں وہاں ان کے داماد بریگیڈئیر زبیر سے رابطہ ہوا ایڈریس لیکر وہاں سے پہنچے وہ اور ان کی ساس بڑی محبت سے ملے۔وہ اپنے شوہر کی یادیں تازہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہوگئیں۔میں کافی دیر اپنے ساتھ بیتی ہوئی یادوں کو دھراتا رہا۔انہوں نے ہماری مہمان نوازی کی۔کچھ دیر بعد ہم وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔

میرے ساتھ پچھلے سالوں کی طرح سفر پر عبدالوہاب اور فیصل آباد سے اس کے دوست عبدالرحمٰن تھا۔عبدالوہاب نے خط بنوانا تھا۔قریبی بازار میں حجام کی دکان تلاش کی یہاں سے فارغ ہوکر ہم وقت گزارنے کے لئے قریبی پارک میں جا بیٹھے یہاں کہیں دھوپ کہیں چھاؤں تھی۔کبھی کبھی ہوا کا جھانکا آتا تو اطمینان محسوس ہوتا۔پارک سے ہم تین بجے نکلے اس دوران چپس اور کولڈ ڈرنک استعمال کی پھر نیٹکو اڈے پر آئے گاڑی چار بجے کی بجائے ساڑھے پانچ اڈے سے نکلی۔گاڑی راستے میں سٹاپ کرتی چلی گئی۔رات کا کھانا ایک ہوٹل شنگریلا پر کھایا اور ساتھ گرم ٹھنڈی کولڈ ڈرنک کا مزا لیا۔یہ ایک طویل سفر ہے جو تھکا دینے والا ہے۔

اگلی صبح 25 اگست بروز ہفتہ کو گاڑی نے ہمیں رائے کوٹ اتارا۔فیری میڈوز کو یہی سٹاپ لگتا ہے۔یہاں سے اُوپر جانے کے لئے جیپ ساڑھے سات ہزار میں کروائی یہ آنے اور جانے کا کرایہ ہے۔جیپ کا سفر دو گھنٹے کا ہے۔اس سے آگے پیدل جائیں یا گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا ہے۔دو ہزار میں گھوڑا کروادیا۔اور یہ خود دونوں پیدل سفر طے کرنے لگے۔ہمارے دوست عبدالوہاب کو ایڈونچر سفر کا بڑا مزا آتا ہے۔یہ پیدل سفر تین گھنٹے کا ہے اور گھوڑے پر دو گھنٹے میں طے ہوجاتا ہے۔

میں ساڑھے سات بجے فیری میڈوز پہنچا جبکہ یہ دونوں نو بجے پہنچے۔یہ جنگل اور رات کے تاریک اندھیرے میں چلتے ہوئے پہنچے۔یہ ان کی ہمت تھی۔میں پہاڑ پر ایک جنرل سٹور پر بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔رات سرد ہوچکی تھی بلکہ سردی پورے جوبن پر تھی۔ایک ہزار روپے میں ایک (کمرہ) کاٹیج کرایہ پر لیا۔سامان کمرے میں رکھا، فریش ہوئے اور رات کے کھانے کی فکر ہوئی سامنے ہوٹل میں رات کا کھانا دال ماش اور چپاتی کھائی کچھ دیر بعد چائے پی اور اپنے کمرے میں آکر سو گئے۔یہاں ہر چیز مہنگی ہے ایک روٹی ستر روپے اور ایک انڈا فرائی ایک سو روپیہ میں اور دال ماش تین سو پچاس روپے میں اور چائے کا کپ 70 روپے میں ملتا ہے۔تھوڑا سا حوالہ فیری میڈوز کی تاریخ کا ہوجائے۔

مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ پریوں نے ہمالیہ کے اس حسین ترین خطے کو اپنی جنت کے طور پر چن رکھا ہے۔فیری میڈوز "پریوں کا دیس" جہاں قدرت پورے طمطراق کے ساتھ جلوہ گر ہے۔گو یہاں پر پریاں نظر نہیں آتیں۔پر یہاں کے مسحور کن مناظر دیکھ کر پریوں کی یادیں بھی نہیں جاتی۔گلگت بلتستان کے ضلع دیامیر میں واقعہ یہ مقام ان چند مقامات میں سے ایک ہے۔چلاس سے ایک گھنٹے کی مسافت پر رائے کوٹ برج کے مقام سے جیپ جاتی ہے۔اپ" تاتو" کے مقام پر پہنچاتی ہے۔تاتو کے مقام تک زیادہ تر پہاڑ خشک اور سنگلاخ راستے ہیں۔پر یہاں سے آگئے کا پہاڑی سلسلہ سرسبز پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ان پہاڑوں پر زیادہ تر چیڑ کے درخت ہیں جن پر کوئی پھل یا پھول نہیں لگتا۔تازہ پانی کے لئے جابجا ٹھنڈے پانی کے تازہ چشمے اور بے شمار آبشاریں موجود ہیں۔تاتو سے فیری میڈوز کا ٹریک چھ کلو میٹر لمبا ہے۔اور ایک ہزار میٹر بلند ہے۔یہ سفر دشوار گزار راستوں پر محیط ہے۔ایک طرف پہاڑ دوسری طرف پانی کا شور ہے۔فیری میڈوز پہنچتے ہیں تو نانگا پربت آپ کے سامنے ہوتا ہے۔فیری میڈوز کو 1995ء میں نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا تھا۔نانگا پربت دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹی ہے۔یہاں کے لوگ مقامی زبان "شنایا" بولتے ہیں۔رہائش کے لئے لکڑی کے کمرے اور کیمپ موجود ہیں۔سب سے دلکش منظر صبح کے وقت دیکھنے کو ملتا ہے۔فیری میڈوز سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر اور ایک ہزار میٹر کی بلندی پر نانگا پربت میں بیس کیمپ موجود ہے۔یہ وہ آخری مقام ہے جہاں تک سیاح جانے کی کوشش کرتا ہے۔اس سے آگئے کا سفر صرف کوہ پیماہ کرتے ہیں۔

26 اگست بروز اتوار صبح سو کر اٹھے باہر کا نظارہ کیا اور ساتھ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا۔غسل کا تو آپ یہاں سوچ بھی نہیں سکتے۔سامنے ہوٹل میں جا کر پراٹھے، انڈہ فرائی اور چائے سے ناشتہ کیا۔اس کے بعد عبدالوہاب، عبدالرحمٰن دونوں نانگا

پربت دیکھنے بیس کیمپ کی جانب کے لئے تیار ہوئے۔ میں نے چند منٹ ساتھ دیا تھوڑی سی بدمزگی سے میں نے اوپر جانے سے انکار کر دیا۔ یہ دونوں بھڑ کیں مارتے ہوئے بیس کیمپ جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ کوئی صبح ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ بامشکل ویو پوائنٹ تک پہنچ پائے۔ ایک جگہ وہاب پھسل گیا اور گرنے سے بچ گیا، خطرناک راستہ تھا۔ گہری کھائیاں تھیں۔ ویسے ویسے بھی پھسلنا اس کی عادت ہے اس کے پاؤں میں موچ آ گئی۔ شام پانچ بجے کے قریب واپسی آیا تو قیدی کی طرح لنگڑا کر چل رہا تھا۔ جب یہ بیس کیمپ کی جانب گئے تھے میں اس دوران دھوپ کا نظارہ کرتا رہا اور ملتان سے آئے گروپ کے ایک فرد سے اپنے موبائیل پر تصاویر بنوائیں۔ پھر شام کو ہم نے قریبی PCO سے اپنے اپنے گھروں میں رابطہ کیا اور بتایا کہ ہم اس وقت کس جگہ پر ہیں۔ عبدالوہاب ہر پل وہاں سے اپنی ویڈیوز اور تصاویر لاہور دوستوں کو وٹس ایپ کرتا رہا جو اس کی عادت ہے۔

یہاں کے لوگوں میں زیادہ مٹھاس نہیں روکھے روکھے پہاڑ کی طرح سخت اور خشک لوگ ہیں اس پہاڑ پر ہماری دوسری رات ہے پھر ہوٹل میں جا کر رات کا کھانا بھنڈی اور دال ماش کھائی اور چائے پی۔ اس دوران گوجرانوالہ سے دس افراد کا گروپ اس ہوٹل میں کھانے کے لیے آیا۔ جب کھانے کی قیمتوں کا پتہ چلا تو حیران رہ گئے۔ ان دوستوں میں اعجاز شریف شامل تھا۔ عبدالوہاب کو چنگیزی (کوئٹہ) گروپ ملا۔ ان میں محمد یونس، رمضان علی، محمد رضا، ڈاکٹر عاصم، غلام تارہ، اسماعیل چنگیزی، علی محمد، طاہر علی شامل تھے۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ کمرے میں آ کر سو گئے۔

27 اگست بروز پیر صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ باہر جا کر کھلے میدان میں یخ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور ناشتے کے لیے ہوٹل میں چلے گئے۔ عبدالوہاب نے انڈے فرائی کے لیے ادرک، ٹماٹر، پیاز اور ہری مرچیں اپنے ہاتھ سے کاٹیں اور انڈے بنوائے۔ پراٹھے انڈے اور چائے سے ناشتہ کیا۔ یہ ناشتہ ہم نے باہر دھوپ میں بیٹھ کر کیا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ یہ دونوں پیدل نیچے ''تاتو'' جیپ کی جگہ پر چل پڑے اور مجھے دو ہزار روپے میں گھوڑا کرائے پر لے دیا۔ میں گیارہ کے قریب وہاں پہنچ گیا جبکہ یہ دونوں ساڑھے گیارہ کے قریب پہنچے۔ میں انتظار کر رہا تھا۔ واپسی پر ایک سیاح کو کہہ کر میں نے گھوڑے پر سوار اپنی تصاویر بنوائیں۔ جیپ والی جگہ بیٹھا تو پشاور سے آئے ہوئے کچھ سٹوڈنٹ سے ملاقات ہوگئی۔ ان میں سے ایک کا نام حارث ہے۔ باقی نام مجھے یاد نہیں وقت گزارنے کے لیے ان سے گپ شپ ہوتی رہی۔ اتنے میں وہاب اور رحمٰن آ گئے۔ ہم جیپ والے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ وقت کا بڑا پابند نکلا۔ ٹھیک پانچ منٹ کم بارہ بجے وہ ہمیں تلاش کرتا ہوا ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم بذریعہ جیپ نیچے رائے کوٹ شاپ پر آئے۔ یہاں گرمی تھی کولڈ ڈرنک پی۔ یہ جیپ اور گھوڑے کا سفر بھی عجیب ہے۔ پتھریلے راستے پر چلتے ہوئے جیپ انسان کی پسلیاں ہلا دیتی ہے جبکہ گھوڑے پر سوار۔۔۔۔ گہری خونی کھائیاں ڈرا دیتی ہیں۔ سچی بات ہے میں تو جاتے اور آتے وقت پورے دو گھنٹے کے راستے میں درود شریف اور توبہ استغفار کرتا رہا۔ نیچے ایک ہوٹل میں کپڑے تبدیل کیے اور فریش ہوئے پھر یہاں سے کوسٹر میں بیٹھ کر گلگت آئے لاہور جانے کی بجائے وادی ہنزہ کی سیر کا پروگرام بن گیا۔

وادی گلگت کا مین بازار دیکھنے چلے گئے۔ وہاں جا کر دیکھا تو سارا بازار بند تھا۔ پوچھنے پر علم ہوا کہ یہاں پر ہر ماہ کی 28 تاریخ کو بازار بند ہوتا ہے۔ گلگت اڈے میں آ کر علی آباد ہنزہ کی گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی پون سات بجے چلی اور اس نے ساڑھے نو بجے وادی ہنزہ علی آباد بازار میں اتار دیا۔ سب سے پہلے ہوٹل کا کمرہ کرائے پر لیا۔ کمرہ سستا ہی مل گیا۔ کمرے میں سامان رکھا منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوئے اور باہر ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے۔ چائے پی اور واپس کمرے میں آ کر دوستوں سے گپ شپ ہوتی رہی پھر سونے سے پہلے کل صبح کا پروگرام بنایا کہ کہاں جانا ہے اس وقت دونوں ساتھی سفر اور مستی کے نشے میں دھت تھے۔ کچھ دیر بعد نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

ہنزہ شمالی پاکستان کا ایک علاقہ ہے اسے وادی ہنزہ بھی کہتے ہیں۔ یہ گلگت سے شمال میں نگر کے ساتھ اور شاہراہ ریشم پر واقعہ ہے۔ اسلام آباد سے 700 کلومیٹر کے فاصلے پر شاہراہ ریشم کے کنارے واقع یہ وادی سطح سمندر سے 2500 میٹر بلند ہے اسلام آباد سے براستہ حسن ابدال، ایبٹ آباد، مانسہرہ، بشام، داسو، چلاس، گلگت سے ہوتا ہوا ہنزہ آتا ہے۔ ایک اور راستہ مانسہرہ سے بالاکوٹ، ناران، اور بابوسر ٹاپ سے چلاس کے ساتھ جا ملتا ہے۔ وادی ہنزہ گلگت سے صرف 100 کلومیٹر اور 2 گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ہنزہ وادی کے لوگوں کی اوسط عمر 100 سال ہے۔ یہ لوگ گوشت بہت کم کھاتے ہیں۔ تین ماہ تک صرف فروٹ کھاتے ہیں۔ یہ دنیا کی واحد جگہ ہے جہاں کینسر کا کوئی مریض نہیں۔ یہ لوگ ٹھنڈے پانی سے نہانا پسند کرتے ہیں۔ انہیں ڈاکٹروں اور دوائیوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں سو فیصد تعلیم ہے ہر پانچواں شخص پی ایچ ڈی ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ تعلیم پر سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کرائم ریٹ زیرو ہے۔

یہاں کے لوگوں کی طویل عمری کا راز گلیشیئر سے آنے والا یہ پانی ہے جو معدنیات اور سلاجیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس کا رنگ گولا مٹی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ اگر اسے سورج کی روشنی میں رکھا جائے تو اس میں سونے جیسے زرات چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں خوبانی، اخروٹ، شہتوت، چیری اور سیب کے باغات باکثرت ملیں گے۔

میں جب بھی انجان جگہ پر جاتا ہوں نیند نہیں

آتی۔ مجھے ایک گولی کا سہارا لینا پڑتا ہے جو ایک دوست نے لگا دی ہے۔ صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ دوسرے دوستوں کو اٹھایا تیار ہو کر باہر علی آباد بازار کے ایک ہوٹل سے ناشتہ کیا۔ یہاں صفائی کا خاص اہتمام ہے۔ آج ناشتے میں چنے، پراٹھے، انڈے فرائی اور چائے شامل تھی۔ یہاں سے آ کر پھر عطاء آباد جھیل کا پروگرام بنایا۔ اس کے راستے میں آنے والی چھوٹی بڑی چار سرنگیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان سرنگوں سے گزرتے ہوئے گاڑی رکوا کر دونوں نے خوب موج مستی کی۔ میں ان کے ڈانس کی ویڈیو بناتا رہا اور تصاویر بھی بنائیں جو بڑی یادگار ہیں۔ جھیل پر پہنچ کر (Jat) کشتی رانی کی سیر کی۔ عبدالوہاب تو خود کشتی چلاتا رہا گائیڈ ساتھ کھڑا تھا لیکن میں گائیڈ کے ساتھ تھا وہی چلا رہا تھا۔ جیٹ (Jat) کا کرایہ فی منٹ ایک سو پچاس روپے تھا۔ ہم تینوں نے پینتیس سو روپیہ اس بوٹ کا کرایہ ادا کیا۔ چند سال پہلے وجود میں آنے والی عطاء آباد جھیل آج کل سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے عقب میں مشکل ترین پہاڑوں کو تراش کر ٹنل بنایا گیا ہے۔ جو زیر آب شاہراہ قراقرم کے متبادل کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ اس عظیم شاہکار کو ہمسایہ ملک چین کے تعاون سے (2012 سے 2015) میں تعمیر کیا گیا ہے۔ تا حد نگاہ قدرتی نظارے انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتے ہیں۔ یہ پوری دنیا میں بننے والی جھیلوں میں سب سے منفرد ہے۔ جو گلگت سے 120 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جھیل کی جگہ پر عطاء آباد نامی گاؤں تھا اور ساتھ بہتا ہوا دریائے ہنزہ نظر آتا ہے۔ چند سال قبل نہ کتابوں میں نہ تصاویر میں اس جھیل کا تذکرہ موجود تھا۔ اب اس گاؤں کی جگہ ایک خوب صورت جھیل نے لے لی ہے۔ عطاء آباد گاؤں ہنزہ کے علاقے کریم آباد سے 14 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ 4 جنوری 2010ء کو اس بدقسمت گاؤں پر ایک قدرتی آفت کے نتیجے میں خوفناک لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے دریائے ہنزہ کا بہاؤ چارہ ماہ رکا رہا۔ جس سے اس گاؤں نے بڑی جھیل کی شکل اختیار کر لی۔ یہ اپنے نیلے پانی کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔

عطاء آباد جھیل کی سیر سے آ کر ہم نے یہاں قدیم قلعہ بلتت دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ قلعہ بلتت گلگت بلتستان پاکستان کی وادی ہنزہ کریم آباد میں ایک قدیم قلعہ ہے۔ یہ دراصل میں ریاست ہنزہ کے آبائی حکمرانوں کا گھر تھا۔ یہ وادی ہنزہ کا سب سے قدیم علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ جس میں موجود یہ قلعہ تقریباً 900 سال پرانا ہے۔ لفظ التیت جس کا مطلب نیچے اور بلتیت کا مطلب ہے اوپر التیت کا پہلا نام کونوکوشل تھا جا کا مطلب ہنزہ کا گاؤں آغا خان ٹرسٹ اور حکومت ناروے کی مدد سے بحال کیا گیا ہے۔ اسے دیکھنے کی ٹکٹ تھی کس چار سو روپیہ ہے۔ اس قلعہ میں لکڑی کے کمرے ہیں۔

جاپان نے پرانے گاؤں اور ارد گرد کی ترقی و تزئین و آرائش میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ التیت قلعہ 2007ء کے عوام کے لیے کھولا گیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں 1972ء میں پہلے نگر کو پاکستان میں شامل کیا گیا اور پھر 1974ء میں ہنزہ بھی پاکستان کا حصہ بن گیا۔ یہ دونوں شہر اس سے قبل آزاد ریاستیں تھیں۔ التیت گاؤں کی پرانی گلیوں اور قدیم ساخت کے مکانوں میں تاریخ بھری پڑی ہے۔ قلعہ کی سیر سے بہت ہی معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہاں بھی ہم نے مختلف تصاویر بنائیں۔ قلعہ سے واپس چڑھائی اترتے ہوئے ایک شاپ سے عبدالوہاب نے کچھ خریداری کی۔ اپنے اور ہمارے گھر والوں کے لیے پرس، بیگ اور اپنے لیے شہد، خوبانی کی گری، قہوہ اور پھر تین حصوں میں تقسیم کیا۔ نیچے کھڑے ہو کر گاڑی کا انتظار کرتے رہے۔ بالآخر وہاب پچھلے سٹاپ سے ایک پک اپ کروالایا۔

اس میں بیٹھ کر ہنزہ علی آباد بازار اپنے ہوٹل میں پہنچے۔ رات ہو چکی تھی۔ وہاب نے اے ٹی ایم سے کچھ رقم نکلوائی۔ ہوٹل میں کھانا کھایا۔ مگر چائے پینا نصیب میں نہ تھا۔ اچانک حالات و واقعات میں گڑ بڑ پیدا ہو گئی تھی۔ ویسے بھی ہر ٹور میں بدمزگی پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اس میں کون کتنی غلطی پر ہوتا ہے۔ اس کا حساب رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کمرے میں آ کر اپنا اپنا سامان پیک کیا۔ پہننے والے کپڑے باہر رکھ لیے۔ تھکاوٹ تھی پھر بھی نیند نہیں آئی۔ آخر کار خواب دکھانے والی گولی کو گلے سے اتارا اور نیند کی وادی میں اتر گیا۔

میں صبح سویرے اٹھ بیٹھا تیار ہو کر انہیں جگایا۔ ہم سب تیار ہو کر سامان اٹھائے ہوٹل کے آفس میں آئے کمرے کا کرایہ ادا کیا باہر آئے تو گاڑی تیار تھی۔ اس میں بیٹھے سات بج کر بیس منٹ پر گاڑی رواں دواں ہوئی اور صبح دس بجے گلگت لاری اڈے پہنچے۔ ہم نے ایک دن پہلے فون پر گلگت سے راولپنڈی تین سیٹیں بک کروائی تھیں۔ یہاں گاڑی چلنے میں ابھی دیر تھی۔ خیر یہیں ہوٹل سے ناشتہ کیا۔ چائے پی یہاں سے گاڑی ساڑھے گیارہ بجے چلی۔ راستے میں سٹاپ کرتی چلی گئی۔ ہم راستے میں کھانا کھاتے، کولڈ ڈرنک پیتے، گپ شپ لگاتے رہے۔ دوسرے دن جمعہ کے روز صبح تین بجے ہم راولپنڈی پہنچے۔ وہاں سے لاہور کے لیے فیصل موورز کی گاڑی سوا پانچ بجے چلی۔ اس نے ہمیں صبح ساڑھے نو بجے لاہور پہنچایا اور یوں ہم دس بجے گھر آئے۔ تھکاوٹ سے بدن چکنا چور جسم بے جان اور دل کی آواز کہ آخر سفر تمام ہوا۔ سفر اچھا رہا اس لیے نہیں کہ دوست اچھے تھے بلکہ اس لیے کہ تفریح کے مقامات اچھے تھے۔

شاعری

ہم نے سمجھا اُنہیں معتبر عمر بھر
غم بڑھاتے رہے چارہ گر عمر بھر
کچھ ستارہ شناسی بھی کام آ گئی
رائیگاں تھا وگرنہ سفر عمر بھر
بس گھڑی دو گھڑی کوئی مہماں رہا
جگمگاتے رہے بام و در عمر بھر
نام اُس کا مرے خیر خواہوں میں ہے
وہ جو مجھ سے رہا بے خبر عمر بھر
گام دو گام تھا ہم سفر وہ مرا
پھر مہکتی رہی رہگذر عمر بھر

حجاب عباسی/کراچی

کچھ تو ہے ہر بات پر جو سوچتے رہتے ہیں ہم
کھو گیا ہے کچھ جو اکثر ڈھونڈتے رہتے ہیں ہم
کوئی چپ سی ہے زباں پر، جو کشا ہوتی نہیں
لوگ کہتے ہیں کہ اکثر بولتے رہتے ہیں ہم
گردشِ دوراں کی کچھ ناکامیوں کو کر کے یاد
نیند کا کر کے بہانہ جاگتے رہتے ہیں ہم
کتنے ہی انجم جو انجمن تھے اپنی ذات میں
رفتہ رفتہ کیسے ڈوبے، دیکھتے رہتے ہیں ہم
چھیڑ جو دیتا ہے اب بھی ذکر اُس بے ربط کا
کچھ نہیں کہتے فقط منہ تاکتے رہتے ہیں ہم
عشق کے بازار میں اک حُسن نامی شخص کو
دید کی شمعیں جلا کر ڈھونڈتے رہتے ہیں ہم
پھونک ڈالا آگ میں کم ظرف نے کیوں گھر مرا

طاق میں رکھے دِیے سے پوچھتے رہتے ہیں ہم
سائے کی حسرت رہی نہ زندگی کی دھوپ میں
اب تو دائم دھوپ ہی کو مانگتے رہتے ہیں ہم
اب اُڑے، ہاں اب اُڑے، بس کہتے کہتے مجتبیٰ

مجتبیٰ شہزاد

رہگذر بھی شیشے کی کاروان شیشے کا
لے رہا ہے ہر کوئی امتحان شیشے کا
ان دنوں جہاں پر ہیں ہم کو ایسا لگتا ہے
ہے زمین شیشے کی، آسمان شیشے کا
ٹوٹنا تو ہے آخر ٹوٹنے سے کیا ڈرنا
پتھروں کی بستی میں ہو مکان شیشے کا
کس قدر ہیں سادہ لوح، تپتی دھوپ میں ہم نے
سر پہ تان رکھا ہے سائبان شیشے کا
شہر ہے محبت کا اور مقامِ حیرت ہے
ہر مکین شیشے کا، ہر مکان شیشے کا

خالق آرزو

بارش میں بھیگنے کی وہ عادت نہیں رہی
پہلی سی اب ہمیں بھی محبت نہیں رہی
غم ہائے روزگار نے یہ بھی ستم کیا
اِک دوسرے سے ملنے کی فُرصت نہیں رہی
رہتا تھا بن کے سایہ کبھی ساتھ جو مرے
وہ کہہ گیا کہ تیری ضرورت نہیں رہی
کِس سمت جا رہا ہے زمانہ یہ دوستو!
اب تو بڑوں کی بھی کوئی عزت نہیں رہی
اعظم غموں نے کر دِیا کمزور اِس قدر
اب اور دُکھ اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی

اعظم سہیل ہارون/حاصل پور

منقبت حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ

آپ ہی مشکل کشا ہیں بے نواؤں کے نوا
گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
آپ کا تو در ولایت سے بھرا گلدان ہے
معرفت میں آپ کی ہستی بڑی ذی شان ہے
نورِ وحدت سے کیے ہیں آپ نے روشن دماغ
جل رہے ہیں آپ کی توقیر کے ہر سُو چراغ
آپ کے در سے کبھی خالی کوئی جاتا نہیں
کون ہے جو صدقہ آقا یہاں کھاتا نہیں
آپ کے دم سے ملا لاہور کو اعزاز ہے
جو بھی آ جائے مقدر اُس کا ہی دم ساز ہے
آپ کا جو بھی ہوا وہ ذی مقدر ہو گیا
غوث و ابدال و ضطب ٹھہرا، قلندر ہو گیا
آپ ہیں آلِ محمدؐ، آپ ولیوں کے امام
پیش کرتا ہے یہ شافؔی باادب ہو کر سلام

عقیل شافی/لاہور

سمندر پار سے

تم اپنا سامان اُٹھا کر لے جاؤ
پھولوں کے دالان اُٹھا کر لے جاؤ
رشتوں کی تضحیک نہیں کر سکتا میں
میرے سارے مان اُٹھا کر لے جاؤ
آوازوں کے شہر میں رکھی خاموشی
جتنی ہے آسان اُٹھا کر لے جاؤ
ان میں کچھ ہیں پر تتلی کے مت لینا
باقی سب گلدان اُٹھا کر لے جاؤ
لفظوں میں تم سارے آنسو رہنے دو
ان میں سے مسکان اُٹھا کر لے جاؤ
مسجد مندر، گرجا گھر کے وحشی تم
اپنے سب بھگوان اُٹھا کر لے جاؤ
میں نے اپنی عمر گزاری ہے جس میں
آؤ وہ زندان اُٹھا کر لے جاؤ
مجھ کو گھٹ کے مرجانے دو کمرے میں
میرا روشن دان اُٹھا کر لے جاؤ
بارش کی بوندوں سے ملنا ہے مجھ کو
اے موسم طوفان اُٹھا کر لے جاؤ
جگنو، تارے، تتلی اور پرندے ہوں
بستی سے انسان اُٹھا کر لے جاؤ

ایاز محمود ایاز/ پیرس

اُس کے گر ہم سفر ہوئے ہوتے
ہم نہ یوں دربدر ہوئے ہوتے
تیرے ہاتھوں شکست کھاتے تو
یوں شکستہ نہ پر ہوئے ہوتے
شادمانی میں سب ہی گاتے ہیں
دُکھ میں ہم نغمہ گر ہوئے ہوتے
گر تمہیں ہوتا کچھ خیال مرا
تم نہ یوں بے خبر ہوئے ہوتے
وہ پلک ایک بار اُٹھ جاتی
ہم بھی کچھ معتبر ہوئے ہوتے
منزلیں پاؤں میں چلی آتیں
آپ جو راہ بر ہوئے ہوتے
دھوپ ساحل پہ پڑتی اُس کی تو
ہم بھی رشکِ سحر ہوئے ہوتے

ارشد نذیر ساحل/ اسپین

آسماں بہت سے ہیں آسماں سے آگے بھی
آؤ گھر بناتے ہیں لامکاں سے آگے بھی
میں یہی سمجھتا تھا سب کو پیچھے چھوڑ آیا
ایک نقشِ پا دیکھا ہے یہاں سے آگے بھی
اپنی جان کر منزل میں جہاں بھی پہنچا ہوں
منتظر مسافت تھی اک وہاں سے آگے بھی
اُس کو یہ گماں ہے اب چاہتا ہے وہ مجھ کو
اور ہے یقیں میرا اس گماں سے آگے بھی
دور سے انہیں شاید نظر آ گئی منزل
لوگ چل پڑے ہیں جو کارواں سے آگے بھی
اک ستارے سے آگے دیکھ ہی نہیں پائے
کہکشائیں کتنی تھیں کہکشاں سے آگے بھی
زندگی گزاری ہے اس لیے یہاں طاہر
آستاں اُسی کا تھا آسماں سے آگے بھی

طاہر عدیل/ ڈنمارک

اکثر میں سوچتا ہوں، بستی مری یہ کیا ہے
فن پارہ ہے کوئی یا بس ایک حادثہ ہے
سقراط زہر پی کے، ثابت یہ کر چکا ہے
سچ بول کے جیا تھا، سچ بول کے مرا ہے
ٹکراتے ہو جو تم ہی، آ بار بار مجھ سے
کیوں سوچتے نہیں ہو، کہ اک ہی راستہ ہے
چائے کے ساتھ سگریٹ اور ڈھیر ساری سوچیں
مزدور ہوں میں صاحب، یہ میرا ناشتہ ہے
ہم دوست جان اپنا، ملنے جسے گئے تھے
نہ تھی خبر کہ اس کا، کمزور حافظہ ہے
چلتا ہوں ساتھ اس کے، مجبور ہوں بہت میں
رہبر وہ کب مرا ہے، کب میرا قافلہ ہے
مارا تھا کل جہاں پر، اک شخص کہہ کے کافر
حیران ہیں وہاں پر، کیوں پھول اک کھلا ہے
بیٹھے ہیں اپنی چھت پر، جوں چاند ہو اُفق پر
آنکھوں کے سامنے ہیں، صدیوں کا فاصلہ ہے
فیاض مان جاؤ، شاعر نہ بن سکو گے
یہ میر، مرزا حسرت، ناصر کا سلسلہ ہے

فیاض ملک/ اسپین

مختصر ادبی خبریں

✦ نامور ادیب ممتاز راشد لاہوری کی والدہ گزشتہ دنوں انتقال کر گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○ ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم ان کے دکھ میں برابر کی شریک ہے۔

✦ الحبیب ادبی فورم کے چیئرمین ذاکر خواجہ گزشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○ ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم ان کے دکھ میں برابر کی شریک ہے۔

✦ خالد پرویز صدر آل پاکستان انجمن تاجران و صدر اُردو بازار لاہور کی والدہ قضائے الٰہی سے وفات پاگئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○ ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم ان کے دکھ میں برابر کی شریک ہے۔

✦ حلقہ اربابِ ذوق کا خصوصی اجلاس ڈاکٹر خورشید رضوی کی زیرِ صدارت ہوا۔ جس میں یاسمین حمید اور حمیدہ شاہین کی شاعری پر بات ہوئی۔

✦ جمیل احمد اور انیسہ صاحبہ نے خوشبیر سنگھ شاد، سعود عثمانی، زریں یاسین اور ڈاکٹر صبیحہ صبا کے اعزاز میں شعری نشست اور مشاعرہ کا اہتمام کیا۔

✦ نامور شاعر اشرف یوسفی کا تازہ مجموعہ ''خواب شہرِ آب'' منظرِ عام پر آ گیا۔

✦ معروف شاعرہ زہرا بتول زہرا کی والدہ وفات پاگئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ سینیٹر خالد شاہین بٹ کی رہائش گاہ پر امجد اسلام امجد کی زیرِ صدارت ایک شاندار مشاعرہ اور عشائیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر ضیاالحسن، حمیدہ شاہین، حسن عباسی، لبنیٰ صفدر اور شوکت فہمی نے بطور مہمان شعرائے شرکت کی۔

✦ معروف شاعر قمر ریاض کے اعزاز میں معاصر انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام عطاالحق قاسمی نے ایمبیسڈر ہوٹل میں بڑے پیمانے پر مشاعرہ کا اہتمام کیا اور پرتکلف عشائیہ دیا گیا۔ ملک سے تمام نامور شعرا نے شرکت کی۔

✦ بزرگ شاعر اور پنجابی کے عمدہ لکھاری گوہر مقصود ایک حادثے میں وفات پا گئے۔

✦ علی مزمل ایک عرصہ سے صاحبِ فراش تھے۔ قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

✦ معروف شاعر ڈاکٹر مدثر جاوید کے والد گرامی انتقال فرما گئے۔

✦ ممتاز ادیب افتخار مجاز ان دنوں علیل ہیں۔ ارژنگ ٹیم صحت یابی کے لیے دعا گو ہے۔

✦ معروف شاعر جاوید رضی ان دنوں سخت علیل ہیں۔ ارژنگ ٹیم ان کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہے۔

✦ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش بھی ادبی دنیا کو سوگوار چھوڑ کر چلے گئے۔

✦ محمد سعید شیخ بھی انتقال فرما گئے۔

✦ منڈی بہاؤالدین میں دائم اقبال دائم کے عرس مبارک پر محفل مشاعرہ و محفل سماع کا اہتمام کیا گیا۔

✦ حرف اکادمی پاکستان کے زیرِ اہتمام محفل مسالمہ بروز ہفتہ 29 ستمبر حرف اکادمی میں منعقد ہوئی۔

✦ معروف شاعرہ یمنیٰ راز اللہ کو پیاری ہو گئی۔

✦ معروف صحافی اور ترقی پسند تحریک کے عظیم رہنما الطاف احمد قریشی بہت بیمار ہیں۔ ادارہ صحت یابی کے لیے دعا گو ہے۔

✦ کاروانِ ادب مانٹریال کے زیرِ اہتمام شاندار انڈو پاک مشاعرہ 4 نومبر کو مانٹریال میں ہوگا جس میں پاکستان، انڈیا اور امریکہ سے شعراء شرکت کریں گے۔

✦ ڈاکٹر امجد پرویز کے بڑے بھائی ڈاکٹر خالد اکرم محمود گزشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○ ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم ان کے دکھ میں برابر کی شریک ہے۔

✦ معروف شاعر نذیر اے قمر کے بڑے بھائی محمد اسلم گزشتہ دنوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○ ادارہ ارژنگ کی پوری ٹیم ان کے دکھ میں برابر کی شریک ہے۔

✦ معروف شاعر عاشق علی عاشق کے شعری مجموعے ''دکھ دی پیڑ'' کی تقریب رونمائی اور محفل مشاعرہ حلقہ اربابِ ذوق اور سیالکوٹ کی فعال ادبی تنظیم ''سوچاں دی مہکار'' کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا۔

✦ پنجاب انسٹیٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کلچر کے زیرِ اہتمام ہارون عدیم کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا اور ان سے ان کی شاعری سنی گئی۔

✦ ڈاکٹر مختار عظمی کے پہلے شعری مجموعہ ''کتاب دل'' کی رونمائی زیرِ صدارت پروفیسر نجیب جمال ہوئی۔ مہمانانِ خصوصی میں میجر (ر) مجیب آفتاب اور ایس پی بشیر خاں شامل تھے۔ مقررین میں ڈاکٹر ایوب ندیم، پروفیسر شفیق احمد خاں، ممتاز راشد لاہوری، محمد جمیل، پروفیسر فاخرہ شجاع، پروفیسر طاہرہ جبیں، منشا قاضی، احمد حسن زیدی، شاہین بھٹی اور زرقا نسیم شامل تھے۔

✤ ادارۂ خیال وفن نے مدیر "شاداب" ڈاکٹر کنول فیروز کے پانچویں شعری مجموعہ "شکستِ صدائے دل" کی تقریب رونمائی الحمراء ادبی بیٹھک لاہور میں منعقد کی۔ صدارت ڈاکٹر تبسم کاشمیری تھے۔ مہمانانِ خصوصی میں اقبال راہی، پروین سجل، کرامت بخاری، فوزیہ اعوان، ڈاکٹر مظفر عباس اور بشپ الیگزنڈر جان ملک شامل تھے۔ اظہارِ خیال کرنے والوں میں نجیب احمد، ممتاز راشد لاہوری، اسلام عظمی، کامران نذیر، ناصر رضوی، سیدہ ساجدہ بانو، آصف عمران، کوثر ایمن، تبسم ناز، فراست بخاری، نجمہ شاہین، بیگم شمیم ملک، حسیب پاشا، احمد حسن زیدی، مسرت ناز، مارتھا ایلون، اقبال بخاری، میجر (ر) خالد نصر، میجر (ر) سید شہزاد کوثر، عزیز شیخ، ریاض احمد ریاض، میاں صلاح الدین، محمد جمیل، اعجاز فیروز اعجاز، غلام مجتبیٰ غلام شبیر آبادی، طاہر بن شہزاد اور زرقا نسیم شامل تھے۔

✤ "ادارۂ خیال و فن"، "راستی انٹرنیشنل" اور "اکادمی ادبیات گلبرگ لاہور" کے اشتراک سے ایران کی معروف شاعرہ و افسانہ نگار "وفا یزدان منش" (صدر شعبہ اُردو، تہران یونیورسٹی) کے اعزاز میں منعقدہ تقریب زیرِ صدارت نجیب احمد ہوئی۔ مقررین میں ڈاکٹر کنول فیروز، نیلما ناہید درانی، ممتاز راشد لاہوری، محمد جمیل، گلوکار عدیل برکی، آغا علی مزمل، ڈاکٹر ایم ابرار، منشا قاضی، ظہیر حسین شیرازی، زاہد محمود زاہد، پرویز وفا ہاشمی، فہیمہ خالد اور تبسم ناز شامل تھے۔

بک ہوم کی شاہکار کتابیں

مثالی ریاست	ارسطو/امجد محمود	1200/-	پاکستان کی سیر گاہیں	شیخ نوید اسلم	1000/-
گھر ہونے تک (آپ بیتی)	میلکم ایکس/عمران الحق چوہان	1000/-	تاریخ ہند	ای۔مارسڈن	800/-
سفرنامہ امریکہ	میکسم گورکی/خورشید جاوید	400/-	داس کیپیٹل	کارل مارکس/سید محمد تقی	1000/-
وادیٔ سندھ اور تہذیبیں	سر مورٹیمر وھیلر/ زبیر رضوی	500/-	خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز	فریڈرک اینگلز	600/-
پنجاب اور بیرونی حملہ آور	پروفیسر عزیز الدین احمد	600/-	معاہدۂ عمرانی	ژاں ژاک روسو/ ڈاکٹر محمود حسین	400/-
سقراط (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	300/-	بڑی سوچ بڑی کامیابی	ڈاکٹر ڈیوڈ جوزف شیوارڈز	600/-
افلاطون (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	400/-	جیسے خیالات ویسی زندگی	برائن ٹریسی/ ملک اشفاق	600/-
ارسطو (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	400/-	مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقاء	ظفر سپل	400/-
بقراط (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	300/-	ورثۂ دانش یونان	ظفر سپل	300/-
ابنِ خلدون (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	600/-	تضحیک اللغات	زاہد مسعود	400/-
ابنِ رشد (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	400/-	تنقیدی نظریات	کرامت بخاری	500/-
ابنِ سینا (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	600/-	پاگل خانہ (افسانے)	نیر اقبال علوی	600/-
ایڈیسن (عظیم موجد کی داستانِ زندگی)	جی گلینوڈ کلارک	400/-	قلعہ (ناول)	فرانز کافکا/ طارق عزیز سندھو	700/-
آئن سٹائن (داستانِ زندگی)	سید شہاب الدین دِسنوی	400/-	چڑیوں کی الف لیلہ	کرشن چندر	500/-
سوشلسٹ روایت موسیٰ سے لینن تک	الیگزینڈر گرے	1800/-	کاندید	والٹیر/ سید سجاد ظہیر	500/-
مسلم لیگ اور تحریک پاکستان	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	1600/-	فاؤسٹ	گوئٹے/ ڈاکٹر سید عابد حسین	600/-
			ماورائے خیر و شر	فریڈرک نطشے	800/-
پاکستان کے آثارِ قدیمہ	شیخ نوید اسلم	1200/-	اساس (Roots) (ناول)	ایلکس ہیلی	

نستعلیق مطبوعات کی کتابیں
بک ہوم سے دستیاب ہے

بک ہوم
بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
فون: 042-37231518-37245072
bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com
www.facebook/bookhomelahore

انہیں دنوں 1978 میں نے ماہ نو کو غزل بھیجی۔ ماہ نو کی ایڈیٹر کشور ناہید تھیں۔ لوگ کافی ڈرتے تھے کہ کلام نہیں چھاپتیں، لیکن میں نے غزل بھیج دی۔ جب وہ میگزین تو اس میں وہ غزل چھپی ہوئی تھی۔ میں بڑا خوش ہوا۔ کچھ دن بعد مجھے یاد پڑتا ہے کہ 29 روپے کا ایک منی آرڈر آیا۔ میں گھر گیا تو ہمارے گھر میں بڑے دنوں بعد گوشت پکا ہوا تھا۔ ماں نے یہ تو نہیں بتایا لیکن مجھ سے پوچھا کہ شاعری سے کوئی پیسے بھی ملتے ہیں، میں نے کہا ماں شاعری سے تو لوگوں نے کاریں کوٹھیاں بنالی ہیں۔ میں نے سوچا کہ ماحول بن رہا ہے تو شائد مجھے اجازت مل جائے۔ تو انہوں نے بتایا کہ تو جس رسالے کا بتا رہا تھا اس کے 29 روپے آئے ہیں، میں تجھے شاعری کی اجازت دیتی ہوں، وہ پہلا دن تھا جب ماں نے مجھے دعا اور شاعری کی اجازت دی اس کے بعد کا سارا سفر ان کی دعا کے طفیل ہے۔

ارژنگ:۔ آپ کی شاعری میں دشت، شجر اور پرندے کے استعارے بہت نمایاں ہیں، اس کا پس منظر کیا ہے؟

جواب:۔ اس کا تعلق بھی میرے والد صاحب سے ہے۔ وہ چڑیوں کو باجرہ ڈالتے تھے۔ روزانہ کی بنیاد پر یہ میری ذمہ داری ہوتی تھی۔ جس دن میں بھول جاتا اس دن اتنی سرزنش کرتے تھے کہ آج بھی یاد کرتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں۔ تو یوں پرندوں سے میرا تعلق بن گیا۔ ایک اور شاعر جس نے مجھے متاثر کیا وہ ہے شکیب جلالی، ان کے ہاں بھی پرندہ آیا۔ پرندوں کے بارے میں نے پڑھا بھی اور انہیں بسر بھی کیا۔ پرندہ غیب کی آواز ہے یگانہ نے اسے ''معنی بے لفظ'' کہا ہے۔ مجھے اس سے بہتر ترغیب آج تک نہیں ملی۔ میں نے ایک واقعہ پڑھا امام رضاؑ کے پاس ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور چڑیوں کا ایک غول آ کر شور کرنے لگا۔ آپ نے سنا اور اس آدمی سے کہا کہ وہاں درخت پر ایک سانپ چڑھ رہا ہے جو وہ ان کے گھونسلے میں جا کر ان کے بچوں کو کھانے لگا ہے۔ جاؤ اس سانپ کو مارو اور ان کے بچوں کو محفوظ بناؤ۔ تو وہ چڑیاں امام کے پاس شکایت لے کر آئی تھیں، امام اور پیغمبر پرندوں کی آواز اور زبان کو سمجھتے ہیں، مجھے یہ بھی ایک دلچسپی ہوئی۔ اور دشت اور پرندے اکٹھے کیسے ہوئے۔ میں کیونکہ میلسی کا رہنے والا ہوں اور چولستان وہاں سے آگے شروع ہوتا ہے۔ نسل در نسل مہاجر کے اندر سے مہاجرت کا احساس نہیں نکالا جا سکتا۔ اور پرندے کے اندر سے بھی نہیں نکالا جا سکتا۔ اب بھی جب وہاں سخت موسم آتا ہے تو لاکھوں پرندے نامعلوم منزل کی طرف بڑھتے ہیں اور یہ سوچ کر بڑھتے ہیں کہ ہم اپنے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ اور جب یہاں آتے ہیں تو شدید گرمی ہوتی ہے۔ تو وہ مر جاتے ہیں۔ تو یہ بات تھی جس نے میرے اندر دشت پرندے اور پھر شجر کو آپس میں جوڑ دیا۔ ہم سب بڑے درویشی دعوے دار ہیں لیکن دیکھیں تو درخت دھوپ میں جلتا ہے اور دوسروں کو پھل اور چھاؤں دیتا ہے۔ کوئی آ جائے تو یہ نہیں کہتا کہ یہ چھاؤں تیرے لئے ہے اور تیرے لئے نہیں۔ ہمارا ایک بچھڑ جائے تو ہم بے حال ہو جاتے ہیں۔ اسکے لاکھوں پتے بکھر جاتے ہیں، وہ ٹنڈ منڈ کھڑا رہتا ہے اس کی زبان سے اف تک نہیں نکلتا۔

ارژنگ:۔ ہیمنگ وے کے خیال میں آپ صرف اس وقت اچھا لکھ سکتے ہیں، جب محبت میں مبتلا ہوں، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب:۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ محبت میں مبتلا ہونے کا فیصلہ کون کرے گا۔ اس حوالے میرا اپنا نظریہ ہے کہ ابتداء میں ایک انس ہوتا ہے، جب تھوڑی سی شدت آتی ہے تو پیار بن جاتا ہے اور تھوڑا آگے جاتے ہیں تو محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ محبت کا معاملہ سب وہم کی پیداوار ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ بڑی شدت سے محبت کر رہے ہوتے ہیں اور جب بریک اپ ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ خودکشی کر لیں گے لیکن چار دن بعد نئی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک وہم ختم ہوا تو دوسرے نے جنم لیا۔ لیکن اگر کسی نے وہم پر اعتبار کر لیا تو وہ عشق میں مبتلا ہو گیا۔ تو اس وہم پر اعتبار کا نتیجہ چند دن میں نہیں پتہ چلے گا۔ کچھ لوگ ساری زندگی اکٹھے گزار دیتے ہیں اور پھر پتہ چلتا ہے کہ ہم تو عشق کرتے ہیں۔ فرض کریں مجھے تخلیقی عمل میں ایک نیا تجربہ ہوتا ہے تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ میں اسے ابھی لکھ سکوں گا، ہو سکتا ہے کہ یہ بیس برس بعد لکھا جائے۔ میں بوڑھا ہوں اور محبت کا شعر کہوں یہ تو ایسا شعر کہنے کی عمر نہیں۔ وہ شائد میرا بیس بائیس سال پرانا تجربہ ہو اور وہ لمحہ میرے اندر ٹھہرا ہوا تھا جواب میچور ہو کر اب سامنے آیا۔

ارژنگ:۔ کیا آپ ہم عصروں یا دوسروں لکھاریوں کے ساتھ کوئی مقابلہ محسوس کرتے ہیں؟

جواب:۔ میں نے ان سے کبھی مقابلہ سمجھا ہی

نہیں، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ میرے برابر کے نہیں ہیں، میں سب کو بڑا سمجھتا ہوں، میں کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا، کئی دوست کہتے ہیں آپ کو فلاں جگہ لگوا دیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ میری منزل یہ نہیں ہے۔ میں تو ابھی منزل کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اور منزل ابھی آگے بھاگ رہی ہے اور میری منزل شعر کہنا ہے۔ میری تو دعا ہے کہ میں شعر کہتا رہوں اور اللہ مجھے تر و تازہ رکھے۔ مقابلہ بے وقوف کرتے ہیں۔

ارژنگ:۔ کیا ادبی گروہ بندیاں ہوتی ہیں؟

جواب:۔ گروہ بندیاں کیا ہوتی ہیں چار لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں اور جو ان سے نہیں کرتے وہ کہتے ہیں یہ ایک گروہ ہے۔ اگر آپ سمجھتے کہ وہ گروہ آپ کے خلاف ہے تو اس کو آپ اپنی طاقت بناؤ۔ میرا خیال ہے کہ میں نے خود اپنا اتنا خیال نہیں رکھا، جتنا مخالفین نے رکھا ہے۔ مجھے بہت وقت دیتے ہیں اور میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔

ارژنگ:۔ آپ ایک نئے شاعر کو دانشورانہ تربیت کے لئے کیا مشورہ دیں گے؟

جواب:۔ مشورہ نہیں گزارش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں شعراء غزل پر محنت کرتے تھے۔ اس لئے کہ فنون کو غزل دینی ہوتی تھی۔ غزل اچھی نہیں ہوگی تو قاسمی صاحب نہیں چھاپتے تھے۔ فنون تین ماہ بعد آئے یا چھ ماہ بعد، کوشش ہوتی تھی کہ انہیں غزل دیں۔ اب معاملہ فیس بک نے بہتر بھی کر دیا ہے اور خراب بھی۔ خراب یوں کہ بہت اچھے شاعر جو محنت کرتے تھے انہوں نے محنت چھوڑ دی ہے، ایک پرانی کہاوت ہے کہ کاتا اور لے بھاگی، ادھر غزل لکھی اور ادھر لگا دی اور پانچ، چھ سو کمنٹ بھی آ جاتے ہیں۔ اور وہ بھی یوں جیسے شادیوں میں نیوندرا دیا جاتا ہے۔ اس طرح کام خراب ہوا، پہلے مایوسی یہ تھی کہ آواز دنیا تک نہیں جاتی اس لئے ہمیں کوئی بلاتا نہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ آواز سوچنے سے پہلے پہنچ جاتی ہے اور اب بھی اگر نہیں بلایا جا رہا تو مایوسی زیادہ ہوگئی ہے۔ نئی نسل اس طرف راغب ہو رہی ہے کہ باہر جانے والے ہمارا نام کٹوا دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نام کوئی نہیں کٹوا سکتا، اللہ پر یقین ہو تو کوئی کسی کا راستہ نہیں روک سکتا۔ آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں امریکہ کے ٹوور پر تھا۔ ثمینہ راجہ میرے بارے میں کوئی مضمون لکھ رہی تھیں کہ وہ شاعر نہیں ہے، چور ہے وغیرہ۔ مجھے لوگ بتاتے تو میں کہتا کوئی بات نہیں۔ میں جب یہاں آیا تو ایک مشاعرے میں میرے ایک دوست کے ساتھ یہی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں میں تو منہ پر بات کروں گی۔ میں نے کہا آپ جو کہہ رہی ہیں، درست کہہ رہی ہیں۔ میں کوئی شاعر وائر نہیں ہوں اور آپ بہت بڑی شاعرہ ہیں۔ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن میں اب بھی کہتا ہوں کہ وہ بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ تو کہتی ہیں کہ میں اس طرح آپ کو شاعر تھوڑی مان لوں گی۔ تو میں نے کہا میں اس لئے تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس مٹی ہے۔ آپ کے پاس سونا ہے۔ اللہ میری مٹی کو سونے کے بھاؤ بیچتا ہے۔ اور آپ کا سونا مٹی کے بھاؤ نہیں بکتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

ارژنگ:۔ مشاعرے بالخصوص بیرون ملک مشاعرے کو ادبی سرگرمی کے طور پر کتنا اہم سمجھتے ہیں؟

جواب: دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ جو مشاعرے میں نہیں جا پاتے، وہ مشاعرے کو برا کہتے ہیں۔ جنہیں بلایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں یہ اچھا ہے، جو مخالف ہیں انہیں بھی اگر بلایا جائے تو فوراً پہنچ جاتے ہیں، بڑے بڑے نام ہیں اور کالموں میں لکھتے ہیں کہ مشاعرہ تو برباد ہوگیا، خراب ہوگیا، اور جب بلایا جاتا ہے تو پہلے پوچھتے ہیں کہ کتنے پیسے دیں گے۔ مشاعرے نے اردو زبان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ بمبئی کی فلمی دنیا نے اور مشاعرے نے زبان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ پھر یہ آڈیو ویڈیو سلسلہ ایسا ہے کہ اس کے ذریعے لوگ کہیں نہ کہیں شاعری سے جڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً میری کتاب کے کئی ایڈیشن چھپے۔ لیکن پھر بھی کتنی تعداد ہوگی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میرا ایک ویڈیو کلپ اڑھائی تین لاکھ لوگوں نے دیکھا ہے۔ تو سرشاری ہوتی ہے میری رسائی کہاں تک ہے، اگر میر و غالب کے دور میں یوٹیوب ہوتی تو ہم آج دیکھ سکتے کہ میر صاحب کیسے شعر پڑھتے تھے، کیسے بیٹھتے تھے، آنے والے زمانوں میں کوئی تو ہوگا جو آج کے کسی شاعر کے بارے میں کہے گا کہ اس نام کا ایک شاعر تھا، یوٹیوب پر دیکھیں گے تو اس کے مشاعرے آ جائیں گے۔ جو کہتے ہیں مشاعرے کو خراب کر دیا گیا۔ ان کے لئے مشورہ ہے کہ اس کا حصہ بنیں اور اسے ٹھیک کر دیں۔ مشاعروں میں ضرور جائیں لیکن شاعری اپنے لئے کریں۔ سٹیج سے نیچے عوام کی سطح پر نہیں اترنا چاہیئے بلکہ عوام کو اوپر اپنی سطح پر لانا چاہیئے۔ اس میں وقت لگتا ہے لیکن لوگ آ جاتے ہیں۔

انٹرویو......ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

ارژنگ: ڈاکٹر صاحب اپنا قلمی اور ادبی سفر بتایئے۔

ڈاکٹر سعدی: بہت شکریہ میڈم! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا جب میں نے اپنے بزم ادب کے پیریڈ میں اپنی لکھی ہوئی تخلیقات نظمیں غزلیں اور کہانیاں سنانا شروع کی تھیں اور انہیں میرے اساتذہ کرام نے بہت سراہا تھا۔ ان کی حوصلہ افزائی سے میرے اندر بہت اعتماد پیدا ہوا اور ان کے کہنے پر میں نے اپنی تخلیقات اس وقت کے روزناموں کوہستان، امروز، مشرق، نوائے وقت، انقلاب، بچوں کی دنیا وغیرہ کو ارسال کرنا شروع کر دیں اور وہ خوش قسمتی سے وقتاً فوقتاً شائع بھی ہونے لگیں۔ مجھے بچپن سے ہی مطالعے کا بہت شوق تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مطالعے کے شوق نے میرے ذہن کو کشادگی بخشی اور میں ادب کی دنیا میں آگے بڑھنے لگا۔ میں یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ اس ادبی شوق اور غیر نصابی مطالعے کے شوق نے میرے تعلیمی سفر میں کوئی خلل نہیں ڈالا جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے پنجاب بھر کے تعلیمی بورڈ لاہور سے 1971 کے میٹرک کے امتحان میں پانچویں پوزیشن حاصل کی تھی اور مجھے نیشنل ٹیلنٹ سکالرشپ ملا تھا۔ میرے 900 میں سے 785 نمبر تھے۔ پھر جب میں کالج میں گیا تو وہاں اخبارات کے علاوہ کالج میگزین اور دیگر نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ میں اپنے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کے میگزین ''مرغزار'' کا ایک سال اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہا ہوں پھر جب میں علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں ایم بی بی ایس کر رہا تھا تو اس وقت اپنے کالج کے میگزین ''شاہین'' کا بھی پہلا اسسٹنٹ ایڈیٹر رہا۔ میں اس عرصے میں کالج میں ادبی سرگرمیوں کا سرخیل تھا۔ میرے لکھے ہوئے مضامین اخبارات اور رسائل میں اکثر شائع ہوتے تھے۔ اللہ پاک کی کرم نوازی سے سکول کے زمانے سے شروع ہونے والا میرا قلم کاری کا سفر اور ادبی سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

ارژنگ: ویری نائس آپ کی تعلیم کیا ہے کچھ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بھی بتائیں۔

ڈاکٹر سعدی: میں نے ایم بی بی ایس کے بعد پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل انسٹیٹیوٹ لاہور سے ڈی سی پی کا کورس کیا اور پھر ویانا سے سکن میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ میں ڈی ایچ کیو ہسپتال گوجرانوالہ کا پہلا سکن سپیشلسٹ ہوں جس نے وہاں سکن کے آؤٹ ڈور کا آغاز کیا تھا۔ اب تو ماشاءاللہ یہ ٹیچنگ ہسپتال بن چکا ہے۔ رہا خاندانی پس منظر تو راجپوت خاندان سے تعلق ہے جو قیام پاکستان کے وقت ہوشیار پور سے ہجرت کر کے آیا اور گوجرانوالہ میں آباد ہوا۔ میرے بزرگ زمیندار تھے اور یہاں گوجرانوالہ میں ہی ہمیں زمینیں الاٹ ہوئی تھیں۔

ارژنگ: شاعری آپ کا حوالہ ہے اب تک کتنی کتب شائع ہو چکی ہیں؟

ڈاکٹر سعدی: میری چھ کتب شاعری کی شائع ہو چکی ہیں تین چار شعری مجموعوں کا مواد تھا کہ مجھے مزاحیہ شاعری کا جنون ہوا اور پھر کتابوں کے چھپنے کا سلسلہ رک گیا۔ مزاح اور پھر شاعری میں مزاح لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اب دس سال کے بعد کہیں جا کے ایک مجموعے کا کلام اکٹھا ہوا ہے۔ اُمید ہے انشاءاللہ 2019 میں اگلے سال یہ چھپ جائے گا۔

ارژنگ: آپ کی یہ شعر گوئی سنجیدہ اور مزاح دونوں رنگوں میں فطری تھی یا اکتسابی؟

ڈاکٹر سعدی: دیکھیں میڈم! کسی بھی کام کی صلاحیت اگر انسان میں فطری نہ ہو تو وہ کوئی بھی کام خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری تو ہوتی ہی فطری جبلت اور رغبت کے سبب ہے۔ اس میں اکتسابی عمل کا دخل کم ہی ہوتا ہے۔ رہی بات سنجیدگی سے مزاح کی طرف آنے کی تو یہ میں نے محنت کر کے اپنے استاد محترم ڈاکٹر انعام الحق جاوید صاحب کی خصوصی شفقت اور رغبت کی وجہ سے اس میں کامیابی حاصل کی ہے اور اب تو میں صرف مزاح ہی لکھتا ہوں۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شاعری اظہار کا موثر ذریعہ ہے اور خصوصاً مزاح کے رنگ میں؟

ڈاکٹر سعدی: جی ہاں! شاعری میں اپنے خیالات کا اظہار آپ موثر طریقے سے کر سکتے ہیں اسی لیے تو اچھی شاعری پڑھتے ہیں۔ دل پہ اثر کرتی ہے۔ رہی بات مزاحیہ شاعری کی تو اس میں آپ مزاح کے رنگ میں وہ ناگوار باتیں بھی شگفتہ انداز میں کر لیتے ہیں اور لوگوں کے چہروں پر بے زاری کی بجائے مسکراہٹ کھلا دیں۔ میں نے ذاتی طور پر جب سے مزاح نگاری شروع کی ہے مجھے زیادہ عزت ملنے لگی ہے۔ مشاعروں میں بعض اوقات لوگ کہتے ہیں کہ جی ہم تو آپ کو سننے آئے ہیں بخدا میں جب تک سنجیدہ لکھتا رہا کسی نے ایسے کمنٹس نہیں دیے تھے۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شاعری ذریعہ عزت ہے۔

ڈاکٹر سعدی: جی ہاں میں سمجھتا ہوں کہ مجھے شاعری نے بہت عزت دی ہے میڈیکل کے پروفیشن کے علاوہ اگر کسی چیز نے مجھے شہرت اور عزت دی ہے اور میرے حلقہ احباب میں بہت وسعت پیدا ہوئی ہے تو یہ شاعری کی وجہ سے ہے۔ حضرت غالب نے کہا تھا کہ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے مقام بنانے میں شاعری نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

ارژنگ: ڈاکٹر صاحب آپ اردو غزل کو آج کس

مقام پر دیکھتے ہیں۔
ڈاکٹر سعدی: بہت اونچے مقام پر۔ آج کی غزل میں جس طرح جدت نے خوبصورتی بلکہ جادوگری بھری ہے اس نے لوگوں کو سحر زدہ کر دیا ہے۔ آج کے شعراء خصوصاً نوجوان شعراء نہایت بلند پایہ غزلیں کہہ رہے ہیں۔ نئے نئے زاویوں سے چیزوں کو دیکھتے ہیں اور نئے نئے ڈھب سے اعلیٰ انداز میں اچھے لفظوں کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں۔
ارژنگ: نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
ڈاکٹر سعدی: نظم کا اپنا ایک مقام ہے نظم بھی بہت شاندار انداز میں لکھی جا رہی ہے لیکن مجھے ذاتی طور پر اس کی طوالت کی وجہ سے نظم زیادہ پسند نہیں۔ غزل میں ایک شعر نے ہی کام دکھا دیا ہوتا ہے اور قاری واہ واہ کر اُٹھتا ہے۔ مشاعرہ گونجنے لگتا ہے اور شاعر کئی منزلیں طے کر لیتا ہے۔
ارژنگ: میں نے سنا ہے آپ گوجرانوالہ میں ادبی تقریبات کروانے میں بہت فعال رہے ہیں۔ آج کل کیا صورت حال ہے؟
ڈاکٹر سعدی: جی میں جب میڈیکل آفیسر تعینات ہو کر ڈی ایچ کیوں ہسپتال میں گیا تو میں نے وہاں ڈاکٹرز لٹریری فورم کی بنیاد رکھی اور ہر ماہ بلکہ پندرہ دنوں بعد ہی ادبی تقریبات کروائیں۔ احباب کے مشوروں پر میں نے ''سفینۂ ادب گوجرانوالہ'' کی بھی بنیاد ڈالی اور شعر و ادب کے حلقے کو وسیع کیا۔ میں نے تقریباً ڈھائی سو کے لگ بھگ ادبی تقاریبات کروائی ہیں۔ میں نے اب سلسلہ ذرا کم کیا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک تو میری مصروفیت بہت زیادہ ہے دوسرا مجھے ہارٹ کا مسئلہ ہوا اور مجھے دو بار دل میں سٹنٹ پڑ چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے ادب کی خدمت میں کمی آئی ہے لیکن میں جو کچھ بھی ہو سکتا ہے ادب کے لیے کرتا ہوں تین چار ادبی پرچوں میں میرا نام بطور ایڈیٹر، انچارج اور سرپرست کے طور پر ہوتا ہے۔ ادب میں ان رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔
ارژنگ: آپ ملک میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں پر کس حد تک مطمئن ہیں؟
ڈاکٹر سعدی: میں ذاتی طور پر مطمئن ہوں کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طور پر اقربا پروری سے ہی سہی ادبی سرگرمیاں تو ہو رہی ہیں بے شک بعض اوقات کسی سرگرمی کی وجہ سے ادبی لوگوں پر اس کا منفی اثر جاتا ہے اور لوگ بددل ہوتے ہیں مگر ہر کسی کو تو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔
ارژنگ: ادبی گروہ بندیاں ادب کی اصل روح کو متاثر نہیں کرتیں؟
ڈاکٹر سعدی: ادبی روح تو شاید متاثر ہوتی ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ گروہ بندی میں ہی سہی ادبی کام تو ہوگا ادبی ہلچل تو ہوگی اور اپنے گروہ کے لوگوں کو ہی سہی کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوگا میرا خیال ہے کہ اگر گروہ بندیاں نہ ہوں تو ادبی سفر متاثر ہو سکتا ہے اور سفر کے سست پڑنے سے ذہنی جمود کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ادبی لوگوں کو کام کرنا چاہیے خواہ وہ گروہ بندی میں ہی سہی ان لوگوں نے اگر اکٹھے نہیں چلنا تو نہ سہی ان کی گروہ بندیوں سے کون سا ملک کی سلامتی وابستہ ہے کہ یہ اکٹھے نہ ہوئے تو ملک کو خطرات پیدا ہو جائیں گے۔
ارژنگ: نئے شعراء کے کلام کے حوالے سے کچھ اظہار خیال کیجیے۔
ڈاکٹر سعدی: ماشاءاللہ نئے شعراء بہت خوبصورت اور بھرپور لکھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے انداز میں اپنے اپنے الفاظ میں، میں ان نئے لکھنے والوں سے بہت متاثر ہوں۔ بہت سے نئے شعراء کا اپنا رنگ اور انداز ہے۔ ہمارے بعد کی یہ نسل ہم سے بہت بہتر اور شاندار انداز میں لکھ رہی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔
ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج ادب برائے زندگی پر ادبی تخلیقات پرورش پا رہی ہیں۔
ڈاکٹر سعدی: جی ہاں میرا خیال یہی ہے کہ آج کل ادبی تخلیقات برائے زندگی برائے ذہنی کشادگی، برائے خوشحالی، ترقی، محبت، یگانگت، خلوص، ایثار وغیرہ پر پرورش پا رہی ہیں۔ ادب برائے ادب کا نظریہ کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ ادب برائے ادب دراصل ایک جمود کا نظریہ تھا۔ اس کے قائل وہ لوگ تھے جو معاشی سیاسی، تمدنی، تعلیمات کے اعتبار سے عوام کی آنکھیں بند رکھنا چاہتے تھے اور ان میں شعور اور ترقی کی خواہش کو اُبھرنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ شاید ایسا ہونے سے انہیں اپنا وجود تحلیل ہونے کا خطرہ تھا۔ شعر گوئی چونکہ ذہن کو وسعت دیتی ہے اس لیے آج کل کے شعراء ادب برائے زندگی کے ہر پہلو کو روشن انداز سے دیکھ رہے ہیں اور ادب کی بلندی اور معیار کو بہت اعلیٰ سطح پر لے جا رہے ہیں۔
ارژنگ: آپ کا شعبہ آپ کو اتنا وقت دے دیتا ہے کہ اپنے آپ کو ادب میں اتنا ان رکھیں۔
ڈاکٹر سعدی: دیکھیں جب ذہن میں کوئی خیال یا تخلیقی تحریک آتی ہے تو وہ اپنا وقت ساتھ لے کر آتی ہے مجھے اس کو نظموں میں ڈھالنے کے لیے وقت نکالنا نہیں پڑتا ہے۔ یہ خود بخود نکل آتا ہے۔
ارژنگ: ارژنگ کے لیے کوئی پیغام؟
ڈاکٹر سعدی: مجھے کئی سال پہلے ارژنگ سے میرے بہت پیارے دوست ابرار ندیم نے متعارف کروایا تھا اور میں نے اس کے لیے اپنی تخلیقات بھی بھیجی تھیں۔ ارژنگ ماشاءاللہ عصر حاضر کے مقبول اور اہم جرائد میں شمار ہوتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی آمد کا انتظار رہتا ہے۔ اس پرچے میں جدت اور نئے امکانات کی تحریریں بہت خوب ہوتی ہیں۔ میرا پیغام اس کے لیے یہی ہے کہ نہایت اچھے انداز میں آگے بڑھ رہا ہے اسے اس انداز کو برقرار رکھنا چاہیے اور جدیدیت کے خطوط پر چلتے ہوئے اپنے انفرادی رنگ کو برقرار رکھنا چاہیے۔ میں اس کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: نور کا جلوہ/شاعر: اعظم سہیل ہارون/صفحات: 128/ قیمت: 300 رائے: محمد امین ساجد سعیدی

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور 0300-4489310

ورفعنا لك ذكرك کے تفسیری نقوش کی جلوہ نمائیاں اور حسن آرائیاں بصورت نعوت سیرت نگاری کہکشاں اور چاند ستاروں کی طرح ہمہ وقت منصۂ شہود پر جگمگا رہی ہیں۔ یہ عہدِ حسین نعت کا پُرشکوہ دور ہے جس میں نعوت لکھی جا رہی ہے اور خوب لکھی جا رہی ہے۔ اب غزل گو بھی نعت کی طرف اپنا رُخ کئے نظریں گنبدِ خضریٰ پہ جمائے عقیدت کے پھول سجائے نعت لکھنے کی سعادت سے بہرہ مند ہو رہے ہیں۔ عزیزم اعظم سہیل ہارون بھی اِسی راہِ سعادت کا راہی ہے۔ اس کا پہلا مجموعۂ غزل ایک دریا ہے میری آنکھوں میں بھی دیکھنے کا موقع مِلا۔ اس کے بعد جب نعت کا مسودہ بصیرت افروز ہُوا تو خوشی کے احساس سے فرحت و شادمانی محسوس ہُوئی۔ نور کا جلوہ اعظم سہیل ہارون کتاب اور صاحبِ کتاب کے تین تین لفظوں کی ترکیب و ترتیب، مماثلت اور نسبت کی تحسین بھی خوب ہے۔ عقیدت و محبت کی چاشنی میں گندھے ہوئے الفاظ سے برجستگی و وارفتگی نے اعظم سہیل ہارون کو نعوتِ نقوش پر اس طرح گامزن کیا ہے کہ وہ نہائیت سلیس اور آسان پیرایہ عشق میں مدحت کے موتی بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ ان کی نعت نگاری میں مدینے کی تڑپ، محفلِ میلاد، یادِ سرکار، وسیلہ استمداد، درود و سلام، ثناء خوانی، صحابہ و اہلبیت، گنبدِ خضریٰ، معراج، نورِ مصطفیٰ اور دیگر خوبصورت پاکیزہ موضوعات کی بوندا باندی نعت کے اشعار میں جابہ جا ہوتی نظر آتی ہے۔ اعظم سہیل ہارون جہاں خوبصورت الفاظ کی ترکیب و بندش، نئے نئے ردیف اور قافیے تراشتے اور تلاشتے ہوئے اشعار میں سجانے کا فن جانتے ہیں وہاں برمحل محاورات کا استعمال بھی اپنے اسلوبِ شعرگوئی میں نکھارتے اور سنوارتے دکھائی دیتے ہیں۔ اعظم سہیل ہارون کی پختگی اور ریاضت نے ان کی سخنوری شاعرانہ رچاؤ اور دیگر فنی خوبیوں کو قرطاس عقیدت پر یُوں عیاں کیا ہے کہ مشکل پسندی کے قالب سے نکل کر معانی مفہوم سہل کاری اور سادہ بحروں کے ذریعے قاری کے قلب و ذہن میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں ردائف و قوافی کی سختی اور سنگلاخ زمینوں کا انتخاب نہیں بلکہ رواں بحروں میں اپنی مقصدیت اور منزل کی طرف گامزن ہو کر آسانی سے قاری کو محبت رسول ﷺ اور اتباع رسول ﷺ کا پیغام دے کر جدّت خیال آفرینی محاکات اور شاعرانہ اسلوب کے پیشِ نظر اپنی عقیدتوں کو ورق ورق پر سطر سطر میں مسطور کئے جاتے ہیں۔ اعظم سہیل ہارون کے اشعار پڑھ کر صنعتِ تلمیح اور تلمیع کے ذریعے ان کے مطالعے کی گہرائی اور گیرائی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ان کے پاکیزہ تصورات اور تخیلات جو مکینِ گنبدِ خضریٰ اور مدینے کے گلی کوچوں میں اس طرح گھومتے اور جھومتے نظر آتے ہیں جو یقیناً ایک عاشقِ رسول ﷺ کی عقیدت و مئودت کے صوتی آہنگ کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کے شعار میں قافیہ پیائی، ردائف کی بندش، رعائتِ لفظی کا حُسن اور بحروں کی موزونیت نیز افاعیل کی نغمگی اور موسیقیت ہی نہیں بلکہ ادب و احترام اور توقیرِ مصطفےٰ ﷺ کا پہلو بھی جابہ جا ملتا ہے اور یہی ایک نعت گو کے کلام کی خوبی اور خصوصیت ہے۔ اعظم سہیل ہارون نعت کے ساتھ حمد، سلام، غزل، نظم اور دیگر اصنافِ سخن میں ہمیشہ مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ اس کے قلم سے جہاں اصلاحی انقلابی اشعار نکلتے ہیں وہاں یہ اپنے اردگرد معاشرتی نشیب و فراز اور گردشِ دوراں کا احوال بھی قرطاس پر رقم کر کے اپنی مشقِ سخن میں مگن رہتا ہے۔

نام کتاب: وادیٔ سندھ اور تہذیبیں/ مصنف: سر مورٹیمر وھیلر/ ترجمہ: زبیر رضوی/ قیمت: 500

ناشر: بک ہوم، بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور۔ فون: 7231518

کسی مخصوص خطے میں تہذیبی ارتقاء سے آگاہی وہاں بسنے والے لوگوں کی تاریخ کے مطالعے میں بنیادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور اس سے آگاہی کی اہمیت مسلمہ ہے۔ پاکستان کی دھرتی دنیا کی اولین تہذیبوں کی امین ہے۔ بلوچستان کے علاقے مہر گڑھ میں دریافت ہونے والی تہذیب نے ثابت کر دیا ہے کہ اس علاقے میں انسانی

تہذیب کی جڑیں ساڑھے ساتھ ہزار سے زیادہ پرانی ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں اس حوالے سے سنجیدہ نوعیت کا کام بہت کم ہوا ہے۔ یہاں پر قدیم کھنڈرات کی دریافت کا زیادہ تر کام نوآبادیاتی دور میں غیر ملکیوں نے کیا اور اس پر تحریری مواد بھی انہی لوگوں کا مرتب کردہ ہے۔ مقامی ماہرین نے بھی پہلے سے موجود تحقیقی کام پر اکتفا کیا۔ قدیم تہذیبوں کے بارے میں زیادہ تر کتابیں کہانیوں اور ناولوں کی شکل میں منظر عام پر آئیں جبکہ دستاویزی کام پر بہت کم توجہ دی گئی۔ ایک اور اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ ان موضوعات پر کتب شائع کرنا کچھ زیادہ منفعت بخش کام نہیں ہوتا اس لیے ناشرین نے بھی اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان موضوعات پر انگریزی کی اہم کتب کے اردو تراجم شائع کیے جاتے۔

زیر نظر کتاب "وادیٔ سندھ اور تہذیبیں" اشاعتی ادارے بک ہوم نے پیش کی ہے جو بلاشبہ ایک مفید کوشش ہے۔ یہ کتاب قدیم تہذیبوں کے محقق سر مورٹیمر وھیلر کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ معروف ادیب زبیر رضوی نے کیا ہے جو ترجمے کے حوالے سے اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ کتاب کل چھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے جن کا کسی نہ کسی حوالے سے سندھ کی تہذیب کے ساتھ تعلق بنتا ہے۔ مصنف نے وادی سندھ کی تہذیب کے ظہور سے پہلے خطے میں موجود تمدن کا بھی جائزہ لیا ہے اور دوسرے باب کا اختتام سندھ کی تہذیب کے خاتمے پر کیا ہے۔

اگلے ابواب میں بعد میں ظہور پذیر ہونے والی تہذیبوں کا احوال ہے اور ان پر وادی سندھ کی تہذیب کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب میں 144 تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جن کی مدد سے قاری ان تہذیبوں کے بارے میں زیادہ بہتر جانکاری حاصل کرسکتا ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انداز تحریر سادہ اور سہل ہے جس کے باعث عام قاری بھی اس کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہے اور لطف اٹھا سکتا ہے۔ مصنف نے وادی سندھ کے حوالے سے مختلف تہذیبوں کے تمام تمدنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ایک مختصر کتاب میں اتنی معلومات جمع کر دی ہیں کہ پڑھنے والے کو تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمن نے کیا ہے۔ ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ کتاب مارکیٹ میں موجود ہے۔ براہ راست منگوانے کے لیے بک ہوم بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور (فون: 042-37231518) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

نام کتاب: ارفع ذات محمدؐ کی / شاعر: قمر حجازی / صفحات: 172 / قیمت: 300
ناشر: مکتبہ قمر، بیچ بیر روڈ، نیو مزنگ لاہور

قمر حجازی کا تعلق نا صرف خطہ زرعی زرخیزی بل کہ ادبی زرخیزی کے حوالہ سے بھی معتبر ہے جہاں بابو رجب سے ہوتے ہوئے اقبال صلاح الدین، ظفر اقبال، مسعود احمد، جلیل احمد، املاک جدران، انور ملک اور دیگر معروف شعراء کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اختصار سے کام لیتے ہوئے دیگر شعراء سے معذرت۔ قمر حجازی اقبال صلاح الدین صاحب سے تلمیذ شدہ ہی نہیں اپنی قابلیت کی بناء پر ان کے ساتھ دیگر کتب کی تیاری اور مدون کرنے میں برابر شریک رہے۔ اُردو، پنجابی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہوئے اب تک بے بہا ادب تخلیق کر چکے ہیں، جس میں منقوط و غیر منقوط غزل، نظم، ماہیے، دوہڑے، ٹپے، گھڑولی، چھند، ہائیکو، بارہ ماہ، مثنوی جگنی غرضیکہ ہمہ جہت اور قادر الکلامی پہ مکمل عبور رکھنے والے شاعر ہیں۔ حاصل موضوع نعتیہ مجموعہ "ارفع ذات محمدؐ کی" ہے۔ اس مجموعہ میں قمر حجازی نے جہاں رسول کریم سے اپنی عقیدت کا بھرپور اظہار کیا ہے وہاں اپنی منفرد طرز تحریر سے نعت کی نئی جہات بھی تلاش کی ہیں۔ قمر حجازی کے شعروں میں قافیہ اور ردیف کا تال میل ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ قمر حجازی نئے قافیے بنانے کا فن بھی جانتے ہیں۔ جو ان کی شاعری کا ایک خاصا بھی ہے۔ قمر حجازی کی شاعری میں ایک اور بات جو قاری کو پڑھنے میں آسانی مہیا کرتی ہے وہ یہ سلیس الفاظ کے ساتھ ساتھ سادگی شعر کو مرقع بنا دیتی ہے جو پڑھنے والے کے دل پہ اثر کرتی ہے۔ قمر حجازی مدرس جیسے مقدس پیشہ سے ریٹائر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا کلام ملک کے ان تمام شہروں میں نا صرف چھپ چکا ہے۔ اب بھی چھپ رہا ہے جہاں بھی کسی ادبی پرچے کا اجراء ہے۔ اب دیکھیں قمر حجازی نے 'عنبر' کو 'معتبر' استعمال کر کے شعر کی خوبصورتی میں اضافہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ پڑھ کر عنبر کی خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ لفظوں کا چناؤ بھی لکھنے والے کے مطالعہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ تکرار لفظی کا بھی شعر کو خوبصورت بنانے میں ایک اہم کردار ہے۔ بہت کم دوست تکرار لفظی کو نبھا پاتے ہیں ان دو اشعار سے یقیناً آپ لطف اندوز ہوں گے۔ آخر میں قمر حجازی کے اس شعر کے ساتھ اختتام

کروں گا۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ توفیق دے۔ آخر میں یہ دعا کہ اے باری تعالیٰ قمر حجازی کی یہ کاوش یہ محبت، یہ اُلفت اس ذات کے صدقے جو دنیا میں ارفع و اعلیٰ ذات ہے قبول فرما۔

نام کتاب: محبت کی نگری / شاعر: محبوب عالم طارق / صفحات: 160 / قیمت: 300
ناشر: پنجاب مرکز کوچہ محمدی سلطان پورہ لاہور

محبوب عالم طارق ایک زود گو شاعر ہے۔ محبوب عالم جہاں قومی زبان سے وابستگی کا اظہار کر رہا ہے وہاں اپنی ماں بولی کو نا صرف سینے سے لگا رکھا ہے بلکہ اس سے قبل اپنی ماں بولی پنجابی کے تین غزل مجموعے اپنے قارئین کو دان اور داد و تحسین کے علاوہ گلشن ادب لاہور سے اول ایوارڈ بھی حاصل کر چکا ہے۔ زیر نظر غزلوں کا مجموعہ "محبت کی نگری" اردو شاعری کا اولین مجموعہ ہے۔ مجموعہ پڑھ کر کہیں بھی اردو، پنجابی میں امتیاز نظر نہیں آتا۔ خطہ اوکاڑا کی ادبی زرخیز زمین کا یہ پھول بھی اقبال صلاح الدین کا کھلایا ہوا ہے۔ مجموعہ اس بات کی بھی گواہی ہے کہ دوران تلازمہ محبوب علی طارق نے کس قدر دلجمعی اور لگن کے ساتھ اپنے اُستاد گرامی سے علم سیکھا ہے۔ طویل بحروں کے ساتھ ساتھ سہل ممتنع کا استعمال بھی ان کی ہنر مندی کا ثبوت ہے۔ محبوب عالم طارق نے روایت سے ہٹ کر سلیس زبان، سادہ الفاظ استعمال کر کے عام قاری کے دل میں اُترنے کی جو کوشش کی ہے بلاشبہ اس میں کامیاب بھی نظر آتا ہے۔ محبوب عالم نے جہاں روایت کی شاعری کی وہاں کہیں کہیں جدت پسندی کا عنصر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ محبوب عالم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نئے رجحانات کو بھی اپنا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی زبان میں پاکستان بھر میں جہاں بھی پنجابی رسالہ اخبار چھپتا ہے وہاں محبوب عالم طارق موجود ہے اور پھر اس تواتر کے ساتھ اب گننا مشکل ہے کہ اب تک کتنا مواد چھپ چکا ہے جن میں چند یہ ہیں۔ لہراں، سویر انٹرنیشنل، لکھاری، رویل، سفنیا، روزنامہ پنجابی اخبار، بھلیکھا، یہ کہنا بے جا نہیں کہ شہر اوکاڑا میں محبوب عالم طارق رسائل میں سب سے زیادہ چھپنے والا شاعر ہے۔

مجھے اُمید ہے محبوب عالم کی یہ ابتدا ان کی منزلوں کا نشان ثابت ہوگی۔ شاعری کی یہ صحرا نوردی محبوب عالم کے جذبے کو مزید پختہ کرے گی۔ ہمیں محبوب عالم طارق کے نئے مجموعہ کا انتظار رہے گا۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محبوب عالم کے اردو شاعری کے اولین مجموعہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

نام کتاب: سب تمہی ہو / شاعر: ہمایوں پرویز شاہد / صفحات: 160 / قیمت: 300
ناشر: گلشن ادب خیبر پارک آؤٹ فال روڈ، لاہور

ہمایوں پرویز نے یہ کس کو مخاطب کر کے کہا ہوگا ہمایوں ہی بتائیں گے۔ ان کا یہ آٹھواں مجموعہ ہے جن میں پنجابی غزلوں اور نعتوں کا انتخاب شامل ہے۔ ان کی منتخب کردہ غزلیں اور نعتیں ان کی ذہنی، فکری سوچ کی بہترین غماز ہیں۔ ہمایوں پرویز نا صرف ایک کہنہ مشق مزدور شاعر ہی نہیں اپنے اُستاد منظور وزیر آبادی کا علم بھی اُٹھائے اور لہرائے پھرتے ہیں۔ کسی بھی شاگرد کے کسی بھی کام میں اُستاد کی جھلک ملتی ہے۔ ہمایوں پرویز کے ہاں استاد کی جھلک ہی نہیں اُن کی اپنی کاوش کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ ہمایوں پرویز روایت کو ساتھ لے کر چلنے والے شاعر کے ساتھ ساتھ اپنی جدت اور انفرادیت بھی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ان کی ذاتی حوالے سے بات کریں تو سخت محنت مزدوری کرنے کے بعد ادب کو بھی کماحقہ وقت دے رہے ہیں۔ ادبی تقریبات کے لیے وقت بھی نکالتے ہیں۔ مزاج کے دھیمے ادب دوست کے ساتھ ساتھ ادب شناس اور ادب پروری ان کا مشغلہ ہی نہیں اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے ادب کی ترویج کی راہ پر گامزن ہیں۔

اب ان کے تازہ شعری مجموعہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس مجموعہ میں عاشق رحیل، حسن عباسی اور ان کے پیر بھائی عمران سلیم کی قیمتی آرا شامل ہیں۔ ان صاحبان نے بھی ہمایوں پرویز کے لیے ستائشی کلمات لکھے ہیں جن کا ہمایوں پرویز حق رکھتا ہے۔ مجموعہ کی ابتدا روایت سے ہٹ کر یعنی حمد اور نعت سے اجتناب برتتے ہوئے غزل سے ہوتی ہے۔ کالج کی تعلیم کے دوران مرحوم پروفیسر اُلفت رسول نے شعر کی تعریف کرتے ہوئے یہ خوبی بھی بتائی "اچھا شعر وہ ہوتا ہے جو پڑھنے اور سننے والے کے دل پر اثر پیدا کر دے"۔

ادب برائے ادب جمود کا نظریہ ہے

جب سے مزاح نگاری شروع کی ہے مجھے زیادہ عزت ملنے لگی ہے

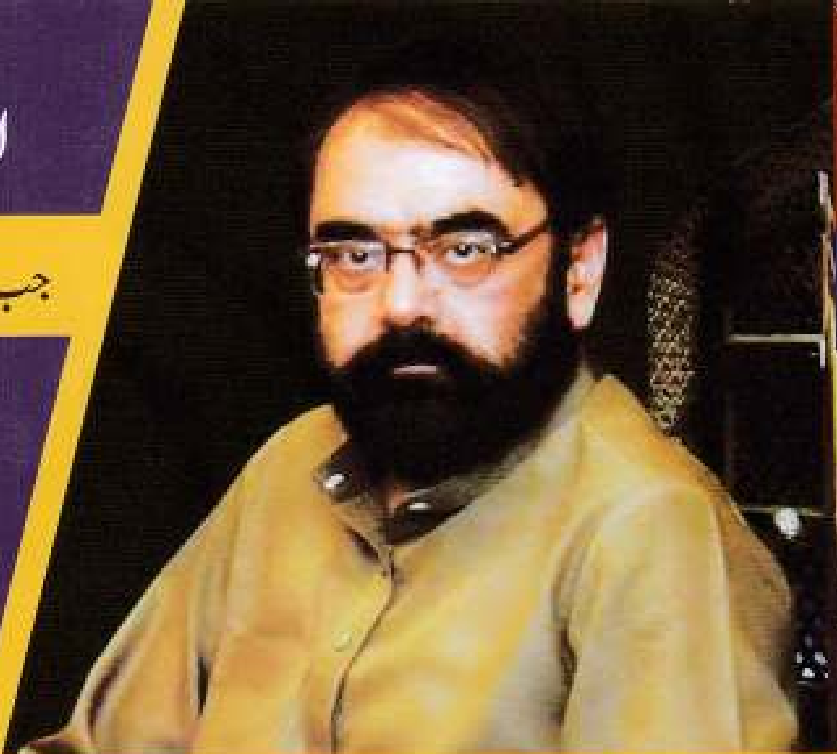

نامور شاعر

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

سے معروف شاعرہ اور کالم نویس

لبنیٰ صفدر کی گفتگو

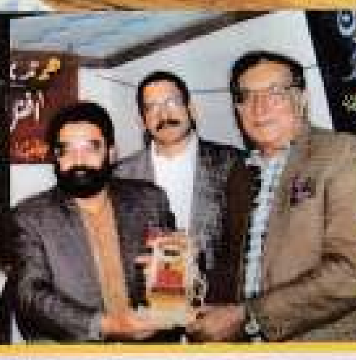

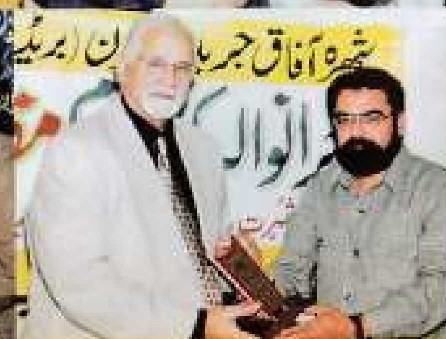

ارژنگ: ڈاکٹر صاحب اپنا قلمی اور ادبی سفر بتایئے۔

ڈاکٹر سعدی: بہت شکریہ میڈم! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا جب میں نے اپنے بزم ادب کے پیریڈ میں اپنی لکھی ہوئی تخلیقات نظمیں غزلیں اور کہانیاں سنانا شروع کی تھیں اور انہیں میرے اساتذہ کرام نے بہت سراہا تھا۔ ان کی حوصلہ افزائی سے میرے اندر بہت اعتماد پیدا ہوا اور ان کے کہنے پر میں نے اپنی تخلیقات اس وقت کے روزناموں کوہستان، امروز، مشرق، نوائے وقت، انقلاب، بچوں کی دنیا وغیرہ کو ارسال کرنا شروع کر دیں اور وہ خوش قسمتی سے وقتاً فوقتاً شائع بھی ہونے لگیں۔ مجھے بچپن سے ہی مطالعے کا بہت شوق تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مطالعے کے شوق نے میرے ذہن کو کشادگی بخشی اور میں ادب کی دنیا میں آگے بڑھنے لگا۔ میں یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ اس ادبی شوق اور غیر نصابی مطالعے کے شوق نے میرے تعلیمی سفر میں کوئی خلل نہیں ڈالا جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے پنجاب بھر کے تعلیمی بورڈ لاہور سے 1971 کے میٹرک کے امتحان میں پانچویں پوزیشن حاصل کی تھی اور مجھے نیشنل ٹیلنٹ سکالرشپ ملا تھا۔ میرے 900 میں سے 785 نمبر تھے۔ پھر جب میں کالج میں گیا تو وہاں اخبارات کے علاوہ کالج میگزین اور دیگر نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ میں اپنے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کے میگزین "مرغزار" کا ایک سال اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہا

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

پاکستان ایسوسی ایشن ادبی فورم کے زیرِ اہتمام

متحدہ عرب امارات کے گرینڈ حیات ہوٹل میں عامر بن علی کے اعزاز میں تقریب

دوبئی کے تمام نامور اہلِ قلم عامر بن علی کے اعزاز میں تقریب میں شامل ہوئے

نامور شاعرہ وادیبہ ڈاکٹر عائشہ عظیم کا اہلِ قلم کے اعزاز میں عصرانہ

عطاء الحق قاسمی، گل نوخیز اختر، یاسر پیرزادہ، ابرار ندیم، عامر بن علی میزبان کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com

MUHAMMAD AHSUN Gull